اِس طرح تو ہوتا ہے



اعتبار ساجد

ترتیب

- ابتدائیہ
- اِس طرح تو ہوتا ہے
- ایڈونچر بھی یاں والی
- جے ڈبلیو بندھن سینٹر
- فکا ہیئے

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

بُنیادی طور پر تو ہم تماشائی ہیں۔ اچھا تماشہ چھوڑتے نہیں، بُرے کی طرف رُخ موڑتے نہیں۔ جہاں کسی نے ڈگڈگی بجائی، ہم نے کن سوئیاں لینی شروع کر دیں۔ کان کھڑے کر لیئے۔ کسی نے پٹاری کھولی تو ہم نے آنکھیں گڑو دیں کہ دیکھیں کس نسل کا سانپ برآمد ہوتا ہے۔ کہیں جھگڑا ہو گیا تو ہم پُشت پر ہاتھ باندھے وہاں جا کھڑے ہُوئے۔ پُوچھنے لگے کہ یہ کیا قصّہ ہے۔ کون کس کا استحصال کر رہا ہے۔ کون پیٹ رہا ہے۔ کون پِٹ رہا ہے۔ اندرُونِ خانہ کیا معاملہ ہے۔ ع

ع اُف یہ ہنگامہ اے خُدا کیا ہے؟

الغرض دُنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی ہم حتی المقدور خبر گیری رکھتے ہیں۔ کوئی بات اچھی لگے تو قہقہہ مار کے ہنستے ہیں، بُری لگے تو کڑوا سا مُنہ بنا کے رُخ پھیر لیتے ہیں۔ کوشش یہی ہوتی ہے کہ دُنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے، ہمارے علم اور اطلاع کے بغیر نہ ہو۔ اگر ہو جائے تو اس کی مرضی۔

ہمیں ریچھ کا تماشہ دیکھنے کا بھی شوق ہے۔ بندر کی شوخیاں بھی ہمیں فوراً اپنی طرف متوجّہ کر لیتی ہیں۔ بکرے کے کرتب بھی ہم شوق سے دیکھتے ہیں۔ تم کون؟ عامل! — مَیں کون؟ معمول! والا کھیل بھی ہم بصد شوق دیکھتے ہیں۔ ٹریفک پولیس

کی پھبتیاں بھی ملاحظہ کرتے ہیں۔ کنڈکٹروں اور ڈرائیوروں کے کمالات بھی دیکھتے ہیں۔ جو لوگ ادیب نہیں ہیں، مگر بننے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں ان کو بھی بچشمِ عبرت دیکھتے ہیں۔ جو لوگ غالبؔ اور اقبالؔ کے اشعار وزن سے خارج کر کے پڑھتے ہیں اور اپنی پسند اور مرضی کے الفاظ ان میں شامل کر دیتے ہیں، وہ بھی ہم سے مخفی نہیں۔ جو لوگ اصولاً آلو گوبھی کی فروخت کے لیے پیدا ہوئے تھے ان کی دانشورانہ اکھاڑ پچھاڑ بھی ہم سے پوشیدہ نہیں۔ جہاں معمول سے ہٹی ہوئی کوئی چیز ہمیں نظر آتی ہے ہم اسے حافظے کی سلیٹ پر لکھ لیتے ہیں۔ کسی کی ناک پسند آئی تو ہم نے درج کر لی۔ کسی کا لہجہ عجیب و غریب لگا تو ہم نے لکھ لیا۔ کسی کی مونچھیں قابلِ گرفت نظر آئیں تو ہم نے ذہن میں محفوظ کر لیں، ان ڈھیر سارے نوادرات کو جمع کر کے چھان پھٹک کے بعد جائزہ لیا تو انکشاف ہوا کہ ایک عدد جندوڈا صاحب معرضِ وجود میں آ گئے ہیں۔

آزمائشی پرواز کے طور پر ہم نے کچھ جندوڈا کہانیاں لکھیں جو "انگور کھٹے ہیں" میں شامل ہوئیں۔ اس طرح ہم نے جندوڈے کا تعارف کروا دیا ـــــ خاصی ملی جلی آرا سامنے آئیں۔ کسی نے کہا ـــــ صاحب، یہ آپ نے کیا اوٹ پٹانگ نام رکھ دیا، اتنے دلچسپ کردار کا ـــــ ؟

ہم نے کہا ـــــ جیسا ڈیل ڈھڑبہ آدمی تھا ویسا ہی نام اہم نے اس پر منطبق کر دیا۔ آپ کو کوئی اعتراض ؟"

انہوں نے کہا ـــ "اعتراض تو کوئی نہیں۔ لیکن اس نام کا صوتی آہنگ عجیب سا ہے۔ بڑا ثقیل اور ناقابلِ تخیل ـــــ"

ہم نے کہا ـــ "مقصد ہمارا بھی یہی تھا کہ یہ نام آسانی سے ہضم نہ ہو، قاری کو پڑھی ہوئی سطر پھر پڑھنے پر مجبور کرے۔ تاکہ جو کچھ ہم نے لمبی لمبی نشستوں میں بیٹھ کر لکھا ہے وہ پڑھا بھی جائے، ضائع نہ ہو"

کسی نے کہا: "ایسے کردار تو بہت مل جاتے ہیں۔ آپ نے انہیں لکھ کر کیا کمال دکھایا؟"

ہم نے عرض کی: "صاحبو، للہ، انصاف سے کام لو۔ ہم نے کب دعویٰ کیا تھا کہ ہم کمال دکھائیں گے۔ آدمی تو سارے ہی ایک جیسے ہیں۔ وہی دو ہاتھ، دو پاؤں، ایک منہ، ایک زبان، دو آنکھیں اور ایک دماغ ـــــ بس کارکردگی میں فرق ہوتا ہے۔ کوئی ایٹم بم بنا لیتا ہے کوئی بنے ہوئے ایٹم بم کی ڈرائیونگ بھی نہیں کر پاتا۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ کردار یکساں نہیں ہوتے۔ بظاہر لگتے ہیں۔ لیکن ان کے ایکشن میں فرق ہوتا ہے۔ یہی فرق جندوڈے اور پروفیسر بی کے بٹالہ کے کرداروں میں بھی ہوتا ہے۔ بھلے آپ آپ ان کے ڈانڈے کہیں ملائیں، فرق صاف ظاہر ہے۔"

ارادہ تو یہ تھا کہ ہم اس کتاب میں جندوڈے کی بہت سی کارکردگیاں جمع کر دیں لیکن ایڈونچر بھیڑیاں والی کی وجہ سے سردست یہ ممکن نہ ہوا۔ کیونکہ ہم پوری کتاب کے قصوں کا ایک ہی موڈ اور مزاج بحال رکھنا چاہتے تھے اور ایک قصے کو دوسرے سے مربوط رکھ کر کچھ تشنگیاں بھی قائم رکھنا چاہتے تھے۔ لہٰذا ہم نے ہر قصے کو کچھ نا تمام چھوڑ دیا۔ روائتی ادیب کی طرح اینٹ پر اینٹ رکھ کے دیوار نہیں کھڑی کی۔ اب ہمارا قاری ایسا بھی نہیں کہ کسی قصہ کے مجموعی تاثر کا لطف نہ لے سکے اور لطیفہ

سُن کر پُوچھنے بیٹھ جائے ـــــ پھر کیا ہُوا؟

پھر کیا ہُوا والے ہمارے قارئین نہیں ہیں ـــــ لہٰذا کتاب کی بے سُود طلب کا غصّہ ہم پہ نہ نکالیں۔ متعلقہ بُک سیلر سے رجوع کریں۔ ہم نے اپنی طرف سے جتنے کردار ایک قصّے میں مطلوب ہو سکتے تھے شامل کر دیئے۔ کوئی ایک منظر کے لیے رُخصت ہُوا کسی نے دو چار مناظر تک قصّے کو آگے بڑھایا ـــــ کوئی آتے ہی بھاگ نکلا۔ کسی نے آخر تک ساتھ نبھایا۔ بہرحال جو فضا ہم نے تخلیق کی اسی کی مطابقت رکھنے والے کرداروں کو قصّوں میں شمولیت کا چانس دیا۔ جہاں دیکھا کہ اب کردار مصنّف کے قابو سے باہر ہُوا چاہتا ہے اور قارئین کے اعصاب پر سواری کا خواہاں ہے وہیں ہم نے پردہ کھینچ دیا کہ چلئے صاحب۔ آپ میک اپ اتاریئے۔ آپ کا کام ختم ہُوا۔ زندگی رہی اور ناظرین نے چاہا تو آپ کو پھر کسی قصّے میں کاسٹ کر لیں گے۔ اور قصّوں کی کیا کمی ہے۔ جہاں جنرل وڈے اور پروفیسر بی کے بٹالہ کا آمنا سامنا ہُوا ایک قصّہ معرضِ وجود میں آگیا۔ لیجئے نئی کتاب حاضر ہو گئی۔ اب اسے قبول یا ردّ کرنا آپ کا کام ہے۔ ناچیز مصنّف کا جو کام تھا وہ اس نے کر دکھایا۔

لیکن ہمارا مسئلہ کچھ عجیب نوعیّت کا ہے۔ کتاب لکھنا اور اسے چھپوانا ہمارے لیے کوئی خاص پریشان کُن مسئلہ نہیں ـــ ہمارے یہ بیشتر کام اللہ کی مہربانی سے ہو جاتے ہیں۔ لیکن طنز و مزاح ایک بالکل الگ معاملہ ہے اور جب تک ایکسپرٹ حضرات اس پر رائے زنی کر کے مُصنّف کو معتوب یا محبوب قرار نہیں دیتے اس وقت تک قارئین کی اکثریت بھی مُنہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھی رہتی ہے۔

ہم نے ایک بڑے ادیب سے گذارش کی کہ ہماری ایک زیرِ اشاعت کتاب پہ

کچھ لکھ دیجئے ـــ فلیپ وغیرہ

بولے "آپ کتاب لکھ سکتے ہیں تو فلیپ کے سلسلے میں بھی خود ہی زحمت فرمایئے۔"

ہم نے کہا ـــ "رائے زنی، شمشیر زنی اور نیزہ زنی وغیرہ تو آپ کا میدان ہے ـــ ہم اس میں کیسے طبع آزمائی کریں؟"

بولے "طنز و مزاح بھی ہماری فیلڈ ہے اس میں آپ نے کیسے طبع آزمائی کر لی؟"

ہم نے کہا "معافی چاہتے ہیں ـــ انشاءاللہ آٹھ دس کتابوں کے بعد اس جسارت سے تائب ہو جائیں گے۔ فی الحال ایک درجن کتابوں تک جان بخشی کا حکم صادر فرمایئے۔"

ایک اور عالم بے بدل سے رجوع فرمایا تو کہنے لگے "میاں مزاح میں کیا رکھا ہے۔ کچھ سنجیدہ چیزیں لکھئے۔"

ہم نے کہا ـــ "بخدا ہم نے بڑی سنجیدگی سے مزاح لکھا ہے۔ چکھ کے تو دیکھئے۔"

کہنے لگے "ہماری نقلی بتیسی گُم ہو گئی ہے۔ نئی کا آرڈر دیا ہے۔ آجائے گی تو پھر دو چار چاول آپ کی دیگ کے بھی چکھ لیں گے۔"

اب معلوم ہُوا ہے کہ ان کا دندان ساز دکان کو تالا لگا کر دوسرے شہر کوچ کر گیا ہے جبھی ان کے علاوہ دیگر ادیب بھی اس دندان ساز کا پتہ پُوچھتے پھرتے ہیں۔

البتہ ہمیں یقین ہے کہ ہمارا کوئی قاری نقلی بتیسی نہیں لگاتا، لہٰذا اُمید ہے کہ اس دیگ کے چاول چکھنے کے لیئے اسے کوئی بہانہ تلاشنے یا تراشنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

جہاں تک ادب کا تعلق ہے، ہم ادب آداب کے بُہت قائل ہیں، بزرگوں سے جُھک کر ملتے ہیں۔ بعضوں کے ہاتھ پر بوسہ دیتے ہیں، بشرطیکہ اطلاع مصدقہ ہو کہ یہ نقاد

ہیں۔ کتابوں کے شوقین ہیں، پڑھتے نہیں، صرف تبصرے لکھتے ہیں۔ وُہ بھی اخباروں میں ٹھوس اور دقیق ادب پڑھنے کا اب کسی کے پاس وقت نہیں رہا۔ کیونکہ سارے ادب آداب سمٹ کر اخبار بن گئے ہیں اور ادیبوں کی بڑی تعداد صحافی بن گئی ہے۔ ادیب اور صحافی کا فرق مٹ جائے تو، وہی ہوتا ہے جو آج کل ہو رہا ہے۔ یعنی ادیب یا شاعر بننا ہے تو رات کو قلم اُٹھائیے۔ صبح مشہور ہو جائیے۔ نہ ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔ سُنا ہے ایک زمانہ تھا، جب ادیب یا شاعر بننا کوئی ہنسی کھیل نہیں تھا۔ یہ شوق لوگوں کو ناکوں چنے چبوا دیتا تھا اور یہ لوہے کے چنے ہوتے تھے۔ ادیب کو شہرت اس وقت ملتی تھی، جب لکھ لکھ کر اس کی انگلیاں ٹیڑھی اور آنکھیں بے نور ہو چکی ہوتی تھیں۔ کمر میں کُب نکل آتا تھا۔ ہاتھ پاؤں میں رعشہ اور آواز میں لڑکھڑاہٹ پیدا ہو جاتی تھی۔ عزیز و اقارب دوست، احباب چچ چچ کرتے تھے۔ کفِ افسوس ملتے تھے۔ مگر وُہ شوقِ ادب سے باز نہیں آتا تھا۔ اپنی دُھن میں لگا رہتا تھا۔ بالآخر جوش ملیح آبادی یا حفیظ جالندھری کے درجۂ کمال تک جا پہنچتا تھا۔ ڈاکٹر اسے لکھنے پڑھنے سے منع کرتے تو جھپٹ کر قلمدان کو اپنے سینے سے لگا لیتا اور برملا اعلان کر دیتا ؎

گو ہاتھ میں جُنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

اکثر اس شوق کے ہاتھوں وہ ہلاک بھی ہو جاتا۔ لوگ اس کی ہلاکت کا سوگ مناتے اس کی تعزیت کرنے پہنچتے تو وُہ فوراً مہمانوں کی آؤ بھگت کے لیے اُٹھ کھڑا ہوتا تھا اور ان کی طرف ہاتھ کا اشارہ کر کے کہتا تھا ؎

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

بعض لوگ بُرا مان جاتے کہ ہم تو تعزیت کے لیے آئے تھے آپ تو جُوں کے توں زندہ سلامت موجود ہیں۔ بڑا افسوس ہُوا، آپ کی یہ حرکت دیکھ کر۔

اس پر وہ سر جُھکا کر کہتا کہ اچھا تو صاحبو، آپ نہیں چاہتے کہ ہم زندہ رہیں تو نہ سہی — یہ کہہ کر پھر لیٹ جاتا اور کنکھیوں سے اپنے رفیقوں کی طرف دیکھ کر کہتا تھا ؎

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگذار تھا

اس پر لوگ خُوش ہو کر تالیاں بجاتے اور اس کی خواہش کی تکمیل کو اپنا فرض جانتے اس نے تو صرف گلیوں میں نعش کھینچے پھرنے کی وصیت کی تھی۔ لوگ بازاروں میں بھی اسے گھسیٹے پھرتے اور تازہ ہُوا کھلاتے رہتے۔ بڑا ہجوم ہوتا۔ بچے میلہ سمجھ کر شرلیاں چھوڑتے پٹاخے چلاتے۔ چھچھوندروں کو آگ دکھا کر شائقین کے پائنچوں کی طرف لڑھکاتے۔ ٹین کھڑکاتے۔ جلیبیاں کھاتے اور ہنستے کھیلتے اپنے گھروں کو چلے جاتے۔ یہ ہوتی تھی بڑے ادیب کی شان۔ اب وُہ زمانہ نہیں رہا۔ کوئی چھوٹا ادیب ہمارے درمیان نہیں پایا جاتا ماشاء اللہ سبھی بڑے ہو گئے ہیں۔ سب کی داڑھی مونچھیں نکل آئی ہیں۔ چھوٹے بڑے کی تفریق ختم ہو گئی ہے۔ ادب میں لفظ مشہور و معروف" عام ہو گیا ہے۔ یہ سب کے ساتھ لگ جاتا ہے اور یکساں لطف دیتا ہے۔ اِسی لیے سب کو اپنے مقام

کی فکر ہے۔ کام کی طرف سے سب بے نیاز ہیں۔ یہ کھکھیڑ پرانے ادیب کے لیئے مخصوص تھی۔ یہ اس کا دردِ سر تھا۔ نئے ادیب سے اس کا کوئی واسطہ کوئی تعلق نہیں۔ اس کی دُور ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات کے ادبی ایڈیشن تک ہے۔ اس سے آگے سوچنے کی اسے فرصت نہیں اور قارئین کو ضرورت نہیں۔

ان حالات میں ہم لکھتے پڑھتے ہیں اور پرانے ادیبوں کی روائتیں اور وضعداریاں نبھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنے تماشائی ہونے کا جواز تو خیر ہم یہ کہہ کر پیش کر دیتے ہیں

؎ بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

لیکن اس کے بعد جب خیر خواہ ہم سے ناسازیٔ طبع کا سبب یہ کہہ کر پُوچھتے ہیں، میاں کیا وجہ ہے آنکھ سوئے افق ہے، رنگ سراسر شفق ہے۔ آخر ہمیں یہ پوچھنے کا حق ہے ع

ع کیوں اُداس پھرتے ہو سردیوں کی شاموں میں

تو جواباً ہمیں وضاحت کرنی پڑتی ہے کہ صاحب کیا بتائیں

اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں

اعتبار ساجد

اِس طرح تو ہوتا ہے



پچھلے کچھ دنوں سے جندو ڈڈے کے سر پر ایک ہی دُھن سوار تھی کہ میں جلد از جلد ایک وڈیو فلم کا اسکرپٹ تیار کروں۔ ایک ایسی فلم جس میں گھوڑے بھی ہوں، لڑائیاں بھی ہوں۔ عشق و محبت سے بھرپور مناظر بھی ہوں، جرم اور قانون کے درمیان زبردست کش مکش بھی ہو اور ایک قوالی اور تین ڈوئٹ بھی ہوں۔" ایک نہایت ضروری اعلان" وہ آسمان کی طرف انگلی کھڑی کر کے مجھ سے مخاطب ہوا۔" ہم اس وڈیو فلم کے لیئے حاجی سُلطان راہی اور بی بی انجمن یا نادرہ کو کوئی زحمت نہیں دیں گے۔ تمام کاسٹ نئے چہروں پر شامل ہو گی اور فی الحال ہیرو کا چہرہ تمہارے سامنے ہے"۔ یہ کہہ کر اس نے نہایت عاجزانہ انداز میں نظریں جھکائیں اور ہاتھ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر سر کو ہلکا سا خم دیا۔

"چین کے شہزادے ـــ عظیم دانشور ـــ میرے دوست پروفیسر بی کے بٹالہ" اس نے اپنے مخصوص پُرجوش خطیبانہ لہجے میں کہا۔" اس عظیم الشان فلم کی تکمیل کے بعد ایک اعلیٰ درجے کی پریس کانفرنس کا انتظام تمہارے ذمے ـــ اس کانفرنس میں ہم ملکی اور غیر ملکی معزز پریس نمائندگان کو فلم دکھائیں گے اور انہیں بتائیں گے کہ اور بجٹ ورک ایسا ہوتا ہے ـــــــ"

"مگر اخراجات ؟"

مَیں نے ہچکچاتے ہُوئے دبی دبی آواز میں کہا۔

"فنانسر بھاگ چکا ہے" جندوڈے نے بلند آہنگ لہجے میں کہا۔ "کیونکہ ہیروئن سے اس کی انڈر سٹینڈنگ نہیں ہو سکی تھی۔ دوسرا کوئی عقل کا اندھا فنانسر فی الحال دستیاب نہیں۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس فلم پر کوئی لاگت نہ آنے پائے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے ؟" مَیں نے حیرت سے کہا۔

"اخراجات کی سب سے بڑی شق یعنی سپر اسٹارز کے معاوضوں والی شق ہم نے نکال دی ہے۔ اداکاروں کے بھاری معاوضوں اور ٹائٹ شیڈولز کی وجہ سے ہم سپرز کو نہیں لے رہے ہیں۔ اس طرح گھر بیٹھے ہم نے چھ سات لاکھ روپے کی بچت کر لی ہے۔ خرچ کی دُوسری شق فلورز کی بُکنگ ہے۔ ہم کسی فلم اسٹوڈیو کا رُخ نہیں کر رہے۔ پُوری فلم آؤٹ ڈور میں مکمل کر رہے ہیں۔ اور آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لیے میرے آبائی گاؤں سے اچھی کوئی جگہ فی الحال دستیاب نہیں۔ اب غور کرو، اس طرح ہم اسٹوڈیو کے تمام اخراجات صاف بچا گئے ہیں۔"

"مگر فلم بندی کے اخراجات ——" مَیں نے سوچتے ہُوئے کہا۔ "ٹیکنیشنز کے معاوضے۔ خاص طور پر فوٹو گرافی کے اخراجات —— ؟"

"ہا ہا ہا" جندوڈا فتح مندانہ انداز میں قہقہہ لگا کر تین چار انچ اپنی جگہ سے اُوپر اُٹھا۔ "چین کے شہزادے —— اس کا بندوبست قدرت نے کر دیا ہے تم اپنے اس پُرانے موویٔ کیمرے کو مت فراموش کرو۔ جسے تم نے پچھلے دنوں کباڑی سے خریدا تھا ——"

مجھے یاد آگیا۔ گذشتہ دنوں یونہی کباڑی بازار میں گھومتے پھرتے پُرانی اور ناکارہ چیزوں کے انبار میں یہ کیمرہ مجھے نظر آگیا تھا، پہلی نظر میں میں اسے دُوربین سمجھا تھا۔ غور سے دیکھنے پر کچھ کچھ شک ہُوا کہ کوئی ڈاکٹری اوزار ہے۔ اسے ہلا جُلا کر اور آنکھوں سے لگا کر اندازہ ہُوا کہ یہ بیس پچیس برس بلکہ اس سے پہلے کی ایجاد ہے۔

خُوش قسمتی سے کباڑی کی نظر اور حساب کمزور تھا۔ لہٰذا آخر وقت تک اسے معلوم نہیں ہُوا کہ مَیں نے کیا نادر الوجود چیز کن داموں میں اس سے خرید لی ہے —— وُہ یہی سمجھتا رہا کہ پلاسٹک کا ایک سیاہ دھبّے دار، بے ڈول اور ناکارہ ڈبہ اس کی دکان سے جا رہا ہے۔ گھر آکر مجھ پر انکشاف ہُوا کہ یہ موویٔ کیمرہ ہے اور اس میں ایم ایم کی ریل لوڈ کر کے اسے بیٹری کے سیلوں سے چلایا جا سکتا ہے۔ مَیں نے اندازے سے اس میں سیل لوڈ کر کے بٹن دبایا تو چند ثانیوں کے بعد اندرونی مشینری میں کرنٹ دُوڑا اور گھر گھر کی خُوش کُن آواز کانوں میں آئی۔ اب مسئلہ اس سائز کی فلم ریل کا تھا جو بازار میں عام طور پر ناپید تھی۔ ایک پُرانے فوٹو گرافر دوست کی منّت سماجت سے یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ کوڈک کی ایک چھوٹی سی رنگین موویٔ فلم مِل گئی۔ جندوڈے نے سائنس کی اس پُرانے فیشن کی ایجاد کو دیکھا تو فرطِ مسرت سے اس کی آنکھیں چمکنے اور نتھنے پھڑکنے لگے۔ اسی روز سے وُہ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گیا کہ سائنس کی اِس قیمتی ایجاد کو جلد استعمال کرنے کی کوئی ترکیب ڈھونڈنی چاہیئے۔ ورنہ مرحوم موجد کی رُوح کو تکلیف پہنچتی رہے گی۔ اس نے یہ بھی جتا دیا کہ مذہب کی رُو سے کسی

ممکن تھا کہ میں دیکھی ہوئی فلموں کی کہانیوں کو ایک دوسرے میں گڈمڈ کر کے ایک ملغوبے کی شکل میں جنڈووڈے کی خدمت میں پیش کر دوں

اور میں نے یہی کیا۔

اس کہانی میں ایک ہیرو تھا، ایک ہیروئن تھی، ایک ویلن تھا ایک گاؤں تھا اور جنڈووڈے کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ اسکرپٹ کے بھاری بھرکم رجسٹر کو بغل میں داب کر اس نے دوسرے ہاتھ سے میری گردن دبوچی، میرے سر کو ایک جھٹکا دیکر اپنی طرف کھینچا اور میری پیشانی پر ایک پیار بھرا بوسہ دے کر بولا۔

"چین کے شہزادے۔ عظیم دانشور میرے دوست پروفیسر بی کے بٹالہ —— مبارک ہو —— میں نے تمہاری ایک بہت بڑی غلطی کھلے دل سے معاف کر دی ہے۔"

"غلطی؟" میں نے بھوئیں آپس میں ملا کر پوچھا —— کیسی غلطی؟"

"فلم کا نام نہ لکھنے کی غلطی ——" اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا —— "ایک بار میں نے کہیں پڑھا تھا کہ دنیا کے بڑے بڑے دانشور اور رائٹر شاہکار پہلے تخلیق کرتے ہیں، نام بعد میں سوچتے ہیں۔ یہ غلطی کر کے تم بھی مشاہیر کی صف میں شامل ہو گئے ہو۔ میری طرف سے مبارک باد قبول ہو ——"

یہ کہہ کر بڑی گرمجوشی سے اس نے مجھ سے دوبارہ ہاتھ ملایا اور تاکید کی کہ میں راتوں رات کوئی چٹ کتا ہوا نام سوچوں، وہ صبح میرے پاس آئے گا اور میرے ساتھ ناشتہ کرے گا تاکہ میرے تجویز کردہ نام کو شرفِ قبولیت بخشے۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ اس تقریب میں سردست تنہا آئے گا، البتہ فلم کا نام متفقہ طور پر منتخب کرنے کے بعد

کے جسم یا روح کو تکلیف پہنچانا بدترین گناہ ہے اور وہ یہ گناہ اپنے سر لے کر میدانِ حشر میں نہیں جانا چاہتا۔

ان دنوں پڑوسی ملک کی طرح اپنے ہاں بھی آرٹ فلموں کی تیاری کی باتیں ہو رہی تھیں۔ آئے دن کوئی نہ کوئی اشتہار کسی نہ کسی اخبار میں نظر آجاتا تھا۔

"ضرورت ہے نئے چہروں کی"

ہمیں اپنی وڈیو فلم کے لیے فوری طور پر
چند نئے چہروں کی ضرورت ہے۔ خواہش مند
حضرات اور خواتین کے لیے شہرت، دولت
اور عزت حاصل کرنے کا نادر موقع
درخواست کے ہمراہ اپنی چند تصویریں اور
جوابی لفافہ بھیج کر گولڈن چانس حاصل کریں

غالباً ایسا ہی کوئی اشتہار جنڈووڈے کی نظروں سے گذرنے کا شرف حاصل کر چکا تھا۔ لہٰذا اب وہ مصر تھا کہ میں فلم کی کاغذی تیاری کے سلسلے میں تاخیری حربوں سے باز آجاؤں اور جتنی جلد ممکن ہو سکے وڈیو فلم کا اسکرپٹ تیار کر کے اس کے حوالے کروں تاکہ اسکرپٹ کے لحاظ سے وہ اداکاروں کو تلاش کرے اور انہیں اس عظیم الشان منصوبے میں شمولیت پر آمادہ کر سکے۔

لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا اسکرپٹ تیار کروں۔ جتنی کہانیاں میرے ذہن میں تھیں، وہ سب کی سب میں فلموں کی شکل میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ البتہ یہ ضرور

مقامی ہوٹل میں فلم کے آغاز کا اعلان کیا جائے گا اور اس تقریب میں وہ تمام فن کار شریک ہوں گے، جن کی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے یہ فلم بنائی جا رہی ہے۔

صبح ہی صبح اس نے دروازے میں ہاتھ ڈال کر زنجیر کنڈے سے الگ کی، اور آن وارد ہُوا۔

اس وقت میں خوابوں کی ایک ایسی خوفناک دُنیا میں تھا، جہاں گھوڑے دَوڑ رہے تھے، بندوقیں چل رہی تھیں اور "اوئے جاگیردارا"، "اوئے زمیندارا"، "اوئے آیا" "اوئے اماں" کے نعرے لگ رہے تھے۔ چاروں طرف عجیب دھاچوکڑی مچی ہُوئی تھی۔ عجیب نفسا نفسی اور آپا دھاپی اور آپا باجی کا سماں تھا۔ اچانک ایک گھڑ سوار نے اپنے گھوڑے سے مجھ پر چھلانگ لگائی، عین ممکن تھا کہ وہ میرا کام تمام کر دیتا کہ میری آنکھ کھُل گئی ——

بلاشُبہ مجھ پر چھلانگ لگائی گئی تھی، مگر یہ گھڑ سوار نہیں جندوڈا تھا۔ وُہ پُرجوش انداز میں مجھے جھنجھوڑ رہا تھا "اٹھو، چین کے شہزادے۔ جاگو ہُوا سویرا۔ دُور ہُوا اندھیرا۔ مُبارک ہو ——" یہ جندوڈے کی طرف سے میرے لیے ایک نئی، سنسنی خیز اور تہلکہ خیز صُبح کی مُبارک باد تھی، جو میں نے چہرے پر پانی کے چھینٹے مار کر آنکھیں تولیے سے صاف کرتے ہُوئے وصول کی۔

جب میں عقبی گلی کی نکڑ پر "اللہ مالک ٹی اسٹال" کے مالک سائیں اللہ رکھا ستانے کو چائے کے دو گرم گلاسوں اور مکھن بند کا آرڈر دے کر اور اخبار کے اندرونی صفحے کو چند لمحوں کے لیے مستعار لے کر کمرے میں واپس آیا تو جندوڈا بیقراری سے ٹہل رہا تھا،

رجسٹر اس کی بغل میں تھا اور وُہ کمرے کے جُھکے جُھکے، خیشے اور سلاخوں کی قید سے آزاد روشن دانوں سے نظر آنے والی کھڑکیوں کے بند کواڑوں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا ——

"اِس محلّے کے مکیں ——" اس نے تاسّف انگیز لہجے میں بتایا۔ "شہر کی سب سے نکمّی اور سُست مخلوق ہیں۔ جب تمام مرد اپنے دفتروں اور کاموں کے لیے نکل چکتے ہیں تب کھڑکیاں کھُلتی ہیں۔ اس وقت ان کے کھُلنے کا کیا فائدہ —— بہرحال مُبارک ہو۔ میں نے تمہیں نام تجویز کرنے کی عصبیت سے نجات دلا دی ہے ——"

یہ کہہ کر اس نے بڑے اہتمام سے رجسٹر کا پہلا صفحہ کھول کر میرے سامنے رکھ دیا میں نے یہ صفحہ خالی رکھا تھا مگر اب اس پر جندوڈے نے اپنے مخصوص بے ہنگم اور جناتی ہینڈ رائٹنگ میں رنگ برنگی پنسلوں سے یہ عبارت آرائی کی تھی :-

جے ڈبلیو آرٹ پروڈکشنز کی عاجزانہ پیش کش

"پگ تے پتلون"

پیش کار : ملک جے ڈبلیو خان

مصنف : ملک جے ڈبلیو خان

ہدایت کار : ملک جے ڈبلیو خان

منتظم اعلیٰ : پروفیسر بی کے بٹالہ

یہ دیکھ کر میرا دل بیٹھ گیا اور میں خود بھی بیٹھ گیا۔ "پگ تے پتلون" کے پیش کار کی حیثیت سے جندوڈا مجھے قبول تھا۔ مصنف اور ہدایت کار کے عہدوں پر اصولاً میری تقرری

ضروری تھی۔ جندوڈے نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے ڈھارس دی۔ چند بھاری بھرکم تھپکیاں دے کر اس نے میرا مورال گرنے سے بچا لیا اور تہہ دل سے مجھے اس بات پر مبارکباد پیش کی کہ میں ایک عظیم الشان فلم کا منتظم اعلیٰ ہوں۔ اور فی زمانہ یہ کوئی معمولی بات نہیں

"البتہ ——" اس نے مجھے یاد دلاتے ہوئے گلہ کیا "اسکرپٹ میں تم نے کوئی قوالی اور گیت درج نہیں کیا —— یہ کمی مجھے خون کے آنسو رُلا رہی ہے —— اور میں ساری رات جاگ کر اس مسئلے پر سوچتا رہا ہوں —— اب فوری طور پر اسکرپٹ کا یہ خلا پُر کرو ورنہ ناشتے سے ہاتھ دھو بیٹھو۔ ——"

یہ کہہ کر رجسٹر اس نے مجھے تھمایا اور خود دروازے میں جا کر کھڑا ہو گیا، تاکہ جونہی چائے والے کی صدا آئے، اسے برعمال بنا سکے۔

میں "پگ تے پتلون" کا حقیقی مصنف اور مسترد ہدایت کار دِل گرفتہ ہو کر دوبارہ کام میں جُت گیا۔ ایک ایسے کام میں جس کے ٹائیٹل یا کریڈٹ پر میرا نام موجود تھا مگر دُوسری حیثیت سے ——

تھوڑی دیر بعد، میں نے رجسٹر کے اوراق میں کتر بیونت کے ساتھ ہی یہ اعلان کر دیا کہ میں نے سچوئیشنز پیدا کر دی ہیں اور گیت صرف اسی صورت میں لکھوں گا، جب موسیقار مجھے سچوئیشن کے مطابق دُھن تیار کر کے دیں گے۔ کیونکہ مناسب دھنوں کے بغیر تیار ہونے والے گیت پُوری فلم کا امیلیٹ بگاڑ کے رکھ دیں گے اور پگ تے پتلون کا بیڑا غرق ہو جائے گا۔

جندوڈے نے چند لمحوں تک مجھے تفتیشی افسر کے انداز میں گھورا۔ آنکھوں میں

آنکھیں ڈال کر میری پروف ریڈنگ کی۔ پھر ایک گہرا سانس لے کر بولا "مست قلندر ہاتھی —— ہمارا پُرانا ساتھی۔ مشہور موسیقار شاعر اور عظیم قوّال و دانشور —— پگ تے پتلون کی ساری موسیقی وہی ترتیب دیں گے —— ڈن —— اب میں جا کر کنٹریکٹ پر سائن کرواتا ہُوں ——"

"کنٹریکٹ کہاں ہے؟" میں نے ہڑبڑا کر پُوچھا۔

"سادہ کاغذ ——" جندوڈے نے ہاتھ لہرا کر کہا اور رجسٹر اُٹھا کر بغل میں دباتے ہوئے بولا "آرٹ فلموں کے پیش کار رسمی کارروائیوں پر یقین نہیں رکھتے —— آؤ، ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے ——"

مست قلندر ہاتھی کو جب جندوڈے نے یہ خوشخبری سُنائی کہ اسے جے ڈبلیو آرٹ پروڈکشنز کی آرٹ فلم "پگ تے پتلون" کا میوزک ڈائریکٹر منتخب کر لیا گیا ہے تو اس کے تھلتھلاتے ہُوئے جسم میں ایک تھرتھری سی پیدا ہُوئی۔ یہ مسرّت کا عملی اظہار تھا مگر ساتھ ہی اس نے جندوڈے کی یادداشت یہ کہہ کر تازہ کر دی کہ پچھلے ڈرامے کی موسیقارانہ خدمات کا اسے کوئی معاوضہ اب تک نہیں ملا۔ نیز یہ کہ سازندے روز آ کر اس سے تقاضا کرتے ہیں اور دست و گریباں ہوتے ہیں۔ ——

یہ کہہ کر وہ کمرے کی کھونٹی پر لٹکا ہُوا اپنا وہ ریشمی کُرتہ اُٹھا لایا جس کے منقش گلے کے نیچے متعدد جھٹکوں سے ادھڑ چکے تھے اور کُرتہ رومال بن چُکا تھا ——

جندوڈے نے گلوگیر لہجے میں فائن آرٹس اور خاص طور پر میوزک کے شعبے میں اس کی ذاتی قربانیوں کو تہہ دل سے خراجِ تحسین پیش کیا اور مبارکباد دی کہ نامساعد حالات

میں بھی اس نے علمِ موسیقی سے اپنی قلبی وابستگی پر آنچ نہیں آنے دی۔

مست قلندر ہاتھی خوش ہوگیا۔ جندوڈے کے ہاتھ چوم کر بولا

"علی جاہ — ملک صاحب — اب میرے لیے کیا حکم ہے؟"

جندوڈے نے رجسٹر کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا — بولا — اب آپ باجہ اُٹھائیں اور سچویشن دیکھ دیکھ کر سُر نکالتے جائیں — جہاں کوئی پریشانی ہو پروفیسر بی کے بٹالہ سے رجوع فرمائیں ——"

مست قلندر ہاتھی نے ایک گہرا، آزردہ اور دلگیر سانس لے کر کہا۔

"جو حکم میرے آقا — مگر طبلے کی تھاپ کے بغیر کوئی دُھن تیار نہیں ہوسکتی اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ سازندے میرے طبلے اُٹھا کر لے گئے ہیں کہ جب میں انہیں بقایا جات ادا کردوں گا تو طبلے واگذار کر دیئے جائیں گے ——"

"خیر —— اس کا بھی بندوبست ہوجائے گا —" جندوڈے نے طویل سانس لے کر کہا —— "فی الحال آپ طبلوں کے بغیر کام چلائیں اور اپنے لیے چائے پانی کے ابتدائی اخراجات کی قسط پروفیسر بی کے بٹالہ سے وصول پائیں۔ کیونکہ وہ اس فلم کے منتظمِ اعلیٰ ہیں۔ اور ان کے ہوتے ہوئے میں انتظامی اور مالیاتی اُمور میں مداخلت کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا"

پھر مُنہ سے گرم و سرد بھاپیں چھوڑتے ہوئے مست قلندر ہاتھی نے سادہ کاغذ پر کنٹریکٹ سائن کیا اور جندوڈے سے ہاتھ ملایا — کچھ دیر تک ہم دونوں یاسں انگیز انداز میں ایک دُوسرے کو دیکھتے رہے اور مُبارک بادیں دیتے رہے۔ پھر طے پایا کہ کل تک مست قلندر ہاتھی اپنے روٹھے ہوئے ساتھیوں کو منا لائے گا اور سب مل بیٹھ کر دُھنیں

تیار کریں گے — یہ اطلاع مجھے جندوڈے نے براہم کی وُہ خاصی عجلت میں تھا۔

"کہاں کے ارادے ہیں جندوڈے، میری جان —" میں نے اس کی عجلت، اضطراب اور پریشانی بھانپ کر پُوچھا — یقیناً وہ ہیروئن کی تلاش کی مہم پر تھا — اور میرا اندازہ صحیح نکلا ——

"مس روبی اللہ دتہ —— جندوڈا ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا — اس شہرِ بے مثل کی ایک نامور فنکارہ — جسے زمانے کی ناقدری نے اُبھرنے نہیں دیا۔ ٹیلہ ماسٹر نیاز محمد آرزو سے اس کا کوئی ٹانکہ فٹ ہے۔ میں اسی کے ذریعے اس پری چہرہ دوشیزہ سے کنٹریکٹ پر سائن کروانے جا رہا ہوں ——"

میں نے اُٹھنے میں دیر نہیں لگائی۔ "مُبارک ہو — میں بھی تمہارے ساتھ چل رہا ہوں —"

جندوڈا ایک دم گڑبڑا گیا — بولا — تم — پروفیسر بی کے بٹالہ! میرے دوست — چین کے شہزادے — عظیم دانشور فی الحال میرے ساتھ نہیں جا رہے کیونکہ یہ مس روبی اللہ دتہ سے فلم پگ تے پتلون کے پیشکار، مُصنف اور ہدایت کار کی پہلی ملاقات ہے — اور ویسے بھی میں اِدھر اُدھر نہیں جاؤں گا۔ راستے میں متعدد چھوٹے موٹے کام ہیں، جنہیں نمٹانا ضروری ہے تم سے مس رُوبی اللہ دتہ کی مُلاقات ضرور کرائی جائے گی، مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے میری چند ملاقاتیں ہوجائیں۔ تاکہ باہمی افہام و تفہیم اخوت اور بھائی چارے کی فضا پیدا ہوجائے — کیا خیال ہے؟"

یہ کہہ کر اُس نے کچکچا کر مجھے جھنجھوڑا اور میرے گلے لگ کر میرے ماتھے پر ایک

بوسہ ثبت کر کے تیز تیز قدموں سے چلتا ہُوا باہر نکل گیا۔

مجھے اُمید تھی کہ رات کو کسی لمحے وُہ جوش و خروش کے عالم میں آ کر مجھے جگائے گا اور مس رُوبی سے اپنی ملاقات کا حال سُنائے گا۔ مگر خلافِ اُمید وُہ رات کو نہیں آیا۔ صبح بھی اس نے اپنی شکل نہیں دکھائی۔ دوپہر کو بھی کہیں نظر نہیں آیا۔

پھر شام کو وُہ عجیب و غریب واقعہ نمودار ہُوا جس نے ہمارے سب خوابوں پر زندہ پھیر دیا۔

اس وقت میں اپنے نائٹ کالج کے ایک نیم تاریک، اکھڑے پلستر والی دیواروں اور شیشوں سے عاری کھڑکیوں والے کلاس رُوم میں اونگھتے بسورتے، بیزار اور تقریباً بے ہوش طلباء کو پڑھا رہا تھا کہ یکایک دروازہ ایک دھماکے سے کُھلا اور ایک سولہ سترہ سالہ لڑکا اندر گھس آیا۔ اس نے کُھلے گلے کا لمبا بے ڈول کُرتہ اور فلیپر نما لاچہ پہن رکھا تھا۔ آنکھوں میں سُرمہ اور بالوں میں تیل چُپڑ رکھا تھا، جس کی دھاریں اس کے چہرے اور گردن سے بہہ کر پسینے میں جذب ہوتی ہوئی عجیب چکاچوند پیدا کر رہی تھیں ——

اس نے میری طرف کوئی توجہ دیئے بغیر لڑکوں کی طرف اپنا منہ کیا اور چنگھاڑ کر بولا۔

"اوئے تم میں پروفیسر گڑبڑ گھٹالہ کون ہے؟

اونگھتے، بسورتے اور جمائیاں لیتے ہُوئے طلباء ہڑبڑا کر بیدار ہو گئے۔ کلاس رُوم میں چند آسودہ قہقہے بھی گونجے ——

"اِدھر مُنہ کرو ——" میں نے گرج کر اُستادانہ طمطراق سے کہا "میں ہُوں پروفیسر بی کے بٹالہ ——کیا بات ہے؟ ——

لڑکے نے فوری طور پر اپنا منہ میری طرف نہیں موڑا۔ بدستور طلباء سے مخاطب رہا۔ اُونچی آواز میں بولا "بات کیا ہوتی ہے۔ وُہ تمہاری پھوپھی کا لڑکا جندوڈا ادھر حوالات میں بند ہے اس نے تمہارے نام رقعہ بھیجا ہے۔ جا کر اسے فوراً چھڑاؤ۔ پولیس نے بڑی پھینٹی لگائی ہے ——"

ہر چند کہ میری کوئی پھوپھی نہیں اور جندوڈے سے دوستی کے علاوہ میرا اور کوئی رشتہ نہیں۔ لیکن حوالات کا نام سُن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ زمین پیروں سے نکل گئی۔ اور مَیں دھڑام سے فرش پر گرتے گرتے بچا —— غالباً اِسی لیے پروفیسر حضرات کے آگے ڈسٹرم رکھے جاتے ہیں، تاکہ اگر بے ہوش ہونے کا کوئی موقعہ آئے تو وہ فرش پر گرنے سے محفوظ رہیں اور ان کے صاف سُتھرے کپڑے خراب نہ ہوں۔

لڑکے نے اپنی جیب سے تیل میں چپڑا ہُوا سگریٹ کا ایک پھٹا ہُوا پیکٹ نکال کر میری طرف بڑھا دیا ——

"میں سگریٹ نہیں پیتا ——" میں نے برہمی سے کہا "اور یہ کلاس روم ہے سمجھے ——؟"

"اور یہ سگریٹ کا پیکٹ نہیں رُقعہ ہے سمجھے؟" لڑکے نے ترکی بہ ترکی کہا۔

پیکٹ کی تہیں کھولنے پر معلوم ہُوا کہ واقعی یہ رُقعہ ہے۔ جندوڈے نے سیاہ اور نیلی پنسل سے سگریٹ کے پیکٹ کی پُشت پر لکھا تھا۔

چین کے شہزادے!

بعد سلام کے واضح ہو کہ یہاں سب خیریت ہے اور آپ کی خیریت خُداوند کریم

سے نیک چاہتا ہوں۔ ضروری تحریر یہ ہے کہ میں برباد ہو گیا۔ لُٹ گیا۔ تباہ ہو گیا۔ میرا لکھ نہیں رہا ـــ آسمان ٹوٹ پڑا ہے اور زمین اُلٹ گئی ہے۔ براہِ کرم ضامن کا بندوبست کر کے فوراً تھانے پہنچو ـــ میں نے احتیاطاً اپنے گاؤں خالو جان قانونی کو بھی رقعہ بھیج دیا ہے ـــ فقط آپ کا عاجز و گناہگار جے ڈیکیو

ضروری نوٹ : رقعہ لانے والی پاکیزہ ہستی کو بطورِ شکرانہ دس روپے نقد پیش کر دیئے جائیں ـــــ

فوراً ہی میں نے جیب ٹٹولی ـــ کُل سات روپے جیب سے نکلے، جو بصد ادب میں نے اپنی جانب سوالیہ نظروں سے گھورتے ہوئے پیغامبر کی خدمت میں پیش کر دیئے ـــ

"اور بقایا تین روپے ؟" اس نے میری بجائے کلاس سے مخاطب ہو کر کہا ـــ

"آہستہ بولو ـــ" میں نے جھینپ کر ماتھے سے پسینہ پونچھا "یہ کلاس روم ہے"

"اور وُہ جیل ہے ـــ" اس نے فوراً کھڑکی سے باہر دُور خلا میں اشارہ کرتے ہوئے کہا "تین روپے دیتے ہو یا میں ان لوگوں سے لے لوں"

"کل آنا ـــ" میں نے اسے پچکارا "تین کی بجائے پانچ روپے ملیں گے ـــ"

"ٹھیک ہے ـــ" لڑکے نے فوری طور پر مفاہمت کر لی "کل کتنے بجے ـــ ؟"

"اِسی وقت ـــــ"

"اِس وقت کیا ٹائم ہوا ہے ـــــ"

"ٹھیک پانچ بجے ـــ ٹھیک پانچ روپے ـــ مُکر نہ جانا ـــــ"

میں جب کلاس رُوم سے باہر نکلا تو اس وقت شہر کا سب سے دِل برداشتہ

بیزار اور شرمندہ آدمی تھا پسینہ تھا کہ رُکنے کا نام نہیں لیتا تھا اور ٹانگیں تھیں کہ جسم کا بوجھ اُٹھانے سے قاصر تھیں ـــ ایک قدم اُٹھاتا تھا اور دو چکر آتے تھے ـــ کھویا آدمی نظر آتا تھا اور آدمی پر کھسیے کا گمان ہوتا تھا ـــ خُدا جانے چندوڈا کن قابلِ اعتراض حالات میں گرفتار ہُوا ہے ـــ جانے اس پر کون سی دفعہ کا اطلاق ہُوا ہے ؟ سب سے پہلے تو مجھے ضامن تلاش کرنا چاہیئے۔ اس کے بعد سوچنے کی باری آئے گی کہ اب کیا کیا جائے ؟ ـــــ

مگر ضامن کی تلاش آسان ثابت نہیں ہُوئی۔ بعضوں نے مُنہ بنایا، بعضوں نے کانوں کو ہاتھ لگایا ـــ بعضوں نے توبہ توبہ کرتے ہُوئے کئی مرتبہ استغفار کا ورد کیا آخر اِس بُرے وقت میں ایک شخص کام آیا ـــــ

سائیں اللہ رکھا مستانہ ـــ پروپرائٹر اللہ مالک ٹی اسٹال !

میں سائیں اللہ رکھا مستانہ اور اس کی جائیداد کے کاغذات کے ساتھ متعلقہ تھانے پہنچا ـــ سائیں نے تھانیدار سے میرا تعارف کرایا۔

"عظیم دانشور، پروفیسر بی کے بٹالہ ـــ ایک امن پسند آدمی اور شریف شہری ـــ"

"آپ کی تعریف ؟" تھانیدار نے مشکوک نگاہوں سے سائیں اللہ رکھا مستانہ کو گھورا

"سائیں اللہ رکھا ـــ" میں نے جلدی سے اس کا تعارف کروایا، اور قصداً اس کا تخلص گول کر دیا ـــ "پروپرائٹر اللہ مالک ریسٹورنٹ اللہ لوک ـــ بے لوث اور مخلص سماجی کارکن ـــ عنقریب آپ حج بیت اللہ کی زیارت پر روانہ ہو رہے ہیں ـــ"

"بڑی خُوشی ہُوئی آپ دونوں سے مِل کر ـــ" تھانیدار نے باری باری ہم دونوں

سے مصافحہ کیا ۔۔۔ "فرمایئے ! مَیں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہُوں ؟"

ہم نے اسے اپنا مسئلہ بتایا۔ یہ سُنتے ہی اس کی خُوش اخلاقی رُخصت ہوگئی ۔۔۔ بھوئیں سُکڑ گئیں ۔۔۔ ماتھے پر بل پڑ گئے ۔۔۔ نتھنوں سے گرم گرم سانسیں خارج ہونے لگیں۔ بولا ۔۔۔ "کیا تعلق ہے جنابِ عالی ! آپ لوگوں کا اس شخص سے ۔۔۔ ؟"

ہم نے دوستانہ تعلقات کا حوالہ دیا ۔۔۔۔۔۔

"مگر وُہ تو آپ سے اپنی رشتہ داری جوڑ رہا تھا ۔۔۔ "تھانیدار نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔

مَیں نے اس پر واضح کیا ۔۔۔ "جب کوئی افتاد پڑتی ہے تو عموماً وُہ مجھے اپنا رشتہ دار بتا کر اپنے دِل کا بوجھ ہلکا کرتا ہے ۔۔۔۔۔۔"

تھانیدار نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرا کہنے لگا ۔۔۔ "مسٹر پروفیسر ۔۔۔ آپ شریف آدمی ہیں تعلیم یافتہ شخص ہیں۔ ایسے آدمی کی دوستی سے باز رہیں۔ یہ شخص آپ کی شہرت کو خراب کر کے دم لے گا۔ میری بات نوٹ کر لیں۔ بہرحال ہم نے اسے موشن پیچر ایکٹ کے تحت گرفتار کیا ہے۔ رات ہماری ٹیم نے ایک تھرڈ کلاس ہوٹل پر چھاپہ مار کر پچیس ۲۵ افراد گرفتار کیے ہیں۔ رنگے ہاتھوں۔ یہ سب کے سب بلیو فلم دیکھ رہے تھے ۔۔۔"

مَیں نے پٹ پٹا کر سائیں اللہ رکھا مستانہ کی طرف دیکھا۔ وُہ اپنی سُرمہ لگی آنکھیں میرے چہرے پر پہلے ہی گڑھوئے بیٹھا تھا۔

"کیا آپ اسے یہاں بُلوا سکتے ہیں ۔۔۔" مَیں نے التجا کی ۔۔۔۔۔۔

"سوری ۔۔۔" تھانیدار نے خشک لہجے میں کہا۔ "چالان مکمل ہو چکا ہے ۔۔۔ اب

تھوڑی دیر بعد ہم کچہری روانہ ہو رہے ہیں۔ آپ لوگ وہیں پہنچیں اور وکیل اور ضمانتی کا بندوبست کر کے عدالت میں پیش ہو جائیں ۔۔۔"

"کیا ہم اس کے پاس جا کر اسے دیکھ نہیں سکتے ؟" مَیں نے کراہ کے کہا۔

"ضرور ۔۔۔" تھانیدار نے تالی بجائی۔ "مگر زیادہ دیر نہیں ۔۔۔"

ایک سپاہی کی معیت میں ہم تھانے کے پچھلے حصّے میں پہنچے۔ یہاں ایک بڑے سے سلاخوں والے کمرے میں بہت سے آدمی بند تھے۔ اور خاصی گہما گہمی اور شور بپا تھا ۔۔۔ جندوڈا دیگر لوگوں کے ساتھ فرش سے ٹیک لگائے تقریباً اوندھا پڑا تھا جب مَیں نے اُسے آواز دی تو وُہ برق رفتاری سے اُچھلا اور ہجوم کو تیر کی طرح کاٹتا ہُوا سلاخوں کی طرف لپکا۔

چین کے شہزادے ۔۔۔" اس نے دل دوز چیخ مار کر میرے شانے تھام لیے ۔۔۔ عظیم دانشور ۔ عزیز ترین دوست ۔ فرشتہ خصلت انسان ۔ پروفیسر بی کے بٹالہ۔ آہ تم آ گئے ۔۔۔ اب مجھے دُنیا کی کوئی طاقت حوالات میں بند نہیں رکھ سکتی ۔۔۔ فوراً دروازہ کھلواؤ تاکہ مَیں باہر نکلوں اور تمہیں گلے سے لگا کر مُبارک باد پیش کروں ۔۔۔" یہ کہہ کر اُس نے آنکھیں مچمچا کر سائیں اللہ رکھا مستانہ کی طرف دیکھا اور گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہُوئے بولا ۔۔۔ اس شہر کے اہلِ تصوّف میں نمایاں نام ۔۔۔ سائیں اللہ رکھا مستانہ اخاہ ۔۔۔ مُبارک ہو ۔۔۔ آپ بھی یہاں پہنچے ہُوئے ہیں ۔۔۔"

سائیں نے صرف ایک ترحم آمیز مسکراہٹ نما خاموشی پر اکتفا کیا۔ کچھ بولا نہیں ۔۔۔ مَیں نے سر سے پیر تک جندوڈے کا جائزہ لیا اگرچہ ایک رات حوالات میں گذارنے

کے بعد اس کی شیو بڑھ گئی تھی، مگر لہجے کی کھنکھناہٹ اور آواز کی سنسناہٹ میں کوئی فرق نہیں آیا تھا ——

"تم تو کل اپنی کچھ اور مصروفیات بتا رہے تھے ——" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا — "پھر یہاں کیسے پہنچ گئے ——؟"

"چین کے شہزادے ——" وہ ایک لمبا سانس کھینچ کر بولا — "یہ میرے خلاف کوئی سازش معلوم ہوتی ہے۔ ٹیلر ماسٹر نیاز محمد آرزو کے جذبۂ رقابت کا منہ بولتا اشتہار —— وہ مجھے مس رُوبی کے گھر لے گیا تھا۔ جب اس نے یہ دیکھا کہ چند منٹوں کے اندر ہی اندر مس رُوبی اللہ دتہ مجھ سے گھُل مل گئی ہے اور تعجب نہیں کہ اس کا پتہ فوری طور پر کاٹ دیا جائے کہ اس نے اچانک مجھے ایک آرٹ فلم دیکھنے کی دعوت دی۔ جو اس کے بقول قریبی گلی کے ایک ہوٹل میں دکھائی جا رہی تھی۔ اس منی سینما گھر کے ڈٹکٹ اس نے اپنی جیب سے بلیک میں خریدے اور مجھے اندر بٹھا کر بولا۔ آپ دو منٹ میرا انتظار کریں۔ میں مس رُوبی کا ایک ضروری کام نمٹا کر ابھی آتا ہوں ——" یہ کہہ کر وہ تو چلا گیا — میں نے قریب بیٹھے ہوئے شخص سے پوچھا وہ آرٹ فلم کب دکھائی جائے گی ——"

وہ بولا "بس ابھی چند منٹوں بعد کھیل چالو ہونے والا ہے — آرام سے بیٹھیں — بڑی نمائشک فلم ہے — چار دفعہ دیکھ چکا ہوں دل نہیں بھرتا ——"

چند لمحوں بعد سامنے دیوار گیر اسٹینڈ پر رکھے ہوئے ٹی وی کی سکرین روشن ہوئی — پہلے تو کچھ ہندسے آئے۔ پھر فلم شروع ہو گئی — ابھی بمشکل پون گھنٹہ گذرا ہو گا کہ پولیس پارٹی نے چھاپہ مار دیا ——

میں نے جھنجھلا کر کہا — مگر تم تو آرٹ فلم دیکھنے گئے تھے۔ جب مطلوبہ فلم نہیں ملی، تو اُٹھ آتے — پون گھنٹے تک کیوں بیٹھے رہے ——؟"

"انتظار، چین کے شہزادے ——" جندوڈے نے گہرا سانس لے کر کہا — "ٹیلر ماسٹر نیاز محمد آرزو کا انتظار —— کیونکہ اسکرپٹ کا رجسٹر اس کے پاس تھا ——"

"بہرحال ——" میں نے آرزو گی سے کہا — "برا ہوا — مزید برا یہ ہونے والا ہے کہ چالان عدالت میں پیش ہونے جا رہا ہے اب مجھے کسی وکیل کی خدمات بھی حاصل کرنی پڑیں گی اور تم جانتے ہو کہ تین ماہ سے مجھے میرے نائٹ کالج نے تنخواہ ——"

"اس کی تم فکر نہ کرو ——" جندوڈے نے میری بات کاٹ دی "کسی وکیل کی ضرورت نہیں۔ میں نے خالو جان قانونی کو رُقعہ بھیج دیا ہے۔ بس وہ پہنچنے ہی والے ہوں گے ان کے آنے کے بعد سارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ ویسے میں نے صبح سے ناشتہ نہیں کیا۔ ایک دس روپے کا نوٹ نکالو۔"

میں نے جیبیں کھنگال کر دس روپے کا ایک نوٹ اس کی طرف بڑھایا ہی تھا، کہ ایک ڈنڈا بردار سپاہی درمیان میں آ کودا۔

"چلیں بھائی صاحبان ——" اس نے ملاقاتیوں کی طرف ڈنڈا گھماتے ہوئے کہا — ملاقات ختم — اب باقی باتیں عدالت میں کرنا ——"

ہم نے واپسی پر اس ملاقات کے لیے تھانیدار کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھا —— وہ پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولا — "کوئی بات نہیں جنابِ عالی۔ یہ تو میرا فرض تھا۔ اگر آپ چالان مکمل ہونے سے پہلے آجاتے تو ممکن ہے، آپ لوگوں کی سفید پوشی کی خاطر میں کچھ

چشم پوشی سے کام لیتا۔ مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ آپ سیدھے عدالت پہنچیں اور پہلا کام یہ کریں کہ کسی وکیل کو پکڑیں ——"

جب ہم تھانے سے باہر نکلے تو سائیں اللہ مستانہ مستانہ نے کہا۔ "اچھا جی! میں تو چلتا ہوں۔ پہلے ہی خاصی دیر ہو چکی ہے۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ میرے بغیر ہوٹل نہیں کھلتا۔ اور یہ بھی آپ جانتے ہیں کہ اس ٹائم پر کتنا رش ہوتا ہے —— اچھا خدا حافظ ——"

یہ کہہ کر رخصتی مصافحے کے لیے اس نے جیسے ہی ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اس کا ہاتھ دبوچ لیا اور گڑگڑا کر عرض کی کہ وہ کچہری کے منجدھار میں مجھے بے یار و مددگار چھوڑ کر رفوچکر ہونے کی کوشش نہ کرے۔ جہاں اس نے اتنا وقت برباد کیا ہے، وہاں تھوڑی دیر اور میرے ساتھ رہے۔ تاکہ ہم ہیڈ کی ضمانت کروا سکیں۔ ورنہ کچہری پہنچ کر میں ضامن کہاں ڈھونڈوں گا؟

میں نے اس کا حوصلہ بڑھانے اور اس کی کھوئی ہوئی توانائیاں بحال کرنے کے لیے بار بار اس کی عظیم سماجی خدمات اور ناقابلِ فراموش کردار کا تذکرہ کیا اور تھانے سے کچہری جاتے ہوئے راستے میں آبدیدہ ہو کر یہ بھی کہا کہ قیامِ پاکستان کے سلسلے میں اس نے جو قربانیاں دی ہیں وہ کبھی فراموش نہیں کی جائیں گی۔ خاص طور پر تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں اس نے جو فعال کردار ——

مگر سائیں مستانہ نے یہ کہہ کر میرا سلسلۂ تقریر منقطع کر دیا کہ فرطِ جذبات میں میں اُسے بہت زیادہ معمر نہ سمجھوں۔ وہ قیامِ پاکستان کے بہت بعد پیدا ہوا ہے ——

چنانچہ باقی راستہ ہم نے خاموشی سے طے کیا، اور ایک دوسرے کو کھنکھیوں سے دیکھتے اور بلاوجہ کھنکھارتے رہے۔

کئی وکیل میرے دوست تھے، مگر بھری پُری کچہری میں قطار اندر قطار سائبانوں میں

اپنے مہربانوں کو ڈھونڈنا ایسا ہی تھا جیسے سمندر میں ڈوبا ہوا پرس تلاش کرنا۔ خاصی دیر ہم اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے۔ کوئی آشنا وکیل نہیں ملا۔ ایک جگہ لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر معلوم ہوا کہ یہ متعلقہ کیس کے متعلقین ہیں اور اپنے متاثرین کی رہائی کے لیے ایک وکیل صاحب کے گرد پروانہ وار جمع ہیں۔

آدمی خاصا معقول اور پڑھا لکھا تھا۔ ہم نے اسے وکیل کر لیا۔ میری جیب میں جو رقم پونجی تھی، وہ میں نے فیس کے طور پر پیش خدمت کر دی۔ کچھ رقم سائیں اللہ رکھا مستانہ نے ہنگامی امدادی فنڈ کی مد سے مجھے بطورِ قرض عطا کی اور وعدہ لیا کہ میں اپنی تنخواہیں وا گذار کرواتے ہی پہلی فرصت میں، تقاضے اور تو تکار سے پہلے قرض کی یہ رقم ادا کر دوں گا۔

وکیل نے کچھ کاغذی کارروائیاں کیں، چند رسمی سوالات کیے، پھر تاکید کی۔

"اب آپ چالان کی نقل نکلوا کر لائیں۔"

پہلے ہم جائے حصولِ نقول کا پتہ پوچھتے ہوئے اوپر گئے۔ پھر نیچے آئے۔ پھر احاطے کا ایک چکر لگایا۔ پھر دوسرا چکر۔ پھر اوپر گئے۔ نیچے آئے اور جب دوبارہ وکیل کے سائبان میں پہنچے تو ایک محتی سے آدمی نے چٹکی بجاتے ہمارا مسئلہ یہ کہہ کر حل کر دیا "تیس روپے فیس دیں۔ میں ابھی نقل آپ کو لا کر دیتا ہوں۔"

مبلغ تیس روپے نصف جن کے مبلغ پندرہ روپے سکہ رائج الوقت ہوتے ہیں وصول کرنے کے بعد اس نے ہمیں انتہائی سیاہ، بھدے اور ڈراؤنے فوٹو سٹیٹ کاغذ کا ایک صفحہ لا کر دیا۔ یہ چالان کی نقل تھی۔ ہم نے جب یہ کاغذ وکیل صاحب کی خدمت میں پیش کیا، تو

انہوں نے یہ کہہ کر ہمارے اوسان خطا کر دیئے کہ اب اس نقل کی ضرورت نہیں، ان کے پاس چالان کی خاصی نقول جمع ہو چکی ہیں اور وہ اجتماعی درخواست پر ایک ہی چالان کی متعدد نقول کو ضروری نہیں سمجھتے۔ اشک شوئی کے لیے انہوں نے ہمیں چائے پلوائی۔ اور خود عدالت کی طرف چلے گئے، جاتے جاتے سائیں کی جائیداد کے کاغذات بھی اپنے ساتھ لے گئے۔

"بس بہت ہو چکی ——" سائیں ان کے جاتے ہی پھٹ پڑا۔ "آدھا دن بیت چکا ہے اور میری دکانداری ——"

"دھیرج مہاراج دھیرج ——" میں نے سائیں کے کندھے پر پیار سے ہاتھ رکھا "بس کام ہونے ہی والا ہے۔ حوصلہ رکھیں۔ سچ پوچھیں تو یہ دنیا آپ ہی جیسے فرشتہ صورت اور آدم دوست لوگوں سے قائم ہے۔ تصوف کی دنیا میں آپ کا جو مقام ہے۔۔۔۔"

مگر سائیں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ وہ کاروباری آدمی تھا اور کاروباری لوگ بزنس کے اوقات میں تصوف کی باریکیوں میں نہیں پڑتے۔ لہٰذا میری منت سماجت کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ قربانی کے ذبح کیے جانے والے بکرے کی طرح ممیا رہا تھا اور بار بار نکل بھاگنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔

"حد ہوتی ہے کسی چیز کی ——" وہ اپنی میلی کچیلی دھندلے شیشوں والی گھڑی میں بار بار وقت دیکھ کر کہتا۔ "حد ہوتی ہے کسی چیز کی۔ میں باز آیا اس نیکی سے۔ خدا کے لیے وکیل صاحب کو ڈھونڈو اور میری جائیداد کے کاغذات میرے حوالے کرو۔ میری توبہ جو میں آئندہ کسی کے کام آؤں ——"

"قومی یکجہتی کا تقاضا ہے کہ ——" میں نے کچھ کہنا چاہا۔

سائیں اللہ رکھا مستانہ بلبلا کر بولا "ساری قومی یکجہتی میرے ہی لیے رہ گئی ہے؟ کیا میرے علاوہ اور کوئی اس شہر میں نہیں بستا؟ حد کرتے ہیں آپ بھی ——"

اچانک ایک دبلا، پتلا، لمبا، سانولا، لمبی ناک اور چمکدار چھوٹی چھوٹی آنکھوں لمبے کانوں اور مہندی رنگے بالوں والا شخص دبے قدموں سے بلی کی چال چلتا ہوا سائبان میں داخل ہوا۔

"یہاں کیا ہو رہا ہے ——" اس نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا ——

ہم پہلے ہی جھلائے بیٹھے تھے۔ چنانچہ سائیں نے تیکھے انداز میں پوچھا۔

"آپ کے خیال میں یہاں کیا ہونا چاہیئے تھا؟"

"میرا مطلب ہے ——" وہ کندھے سے ایک ملگجا رومال اتار کر بنچ جھاڑ کر اس پر بیٹھتے ہوئے بولا ——" کیس کی کیا پوزیشن ہے۔ اغوا یا دھوکہ دہی؟"

"موشن پیکچر ایکٹ ——" میں نے جھلا کر کہا۔

اس پر نووارد نے دم سادھ لیا۔ چند لمحوں تک اخبار کی آڑ سے مجھے مشتبہ انداز میں گھورتا رہا پھر کھسکتا ہوا میرے قریب آ گیا۔ "میں ابھی ابھی موضع بھمبیریاں والی سے آیا ہوں۔"

بھمبیریاں والی جندوڈے کے گاؤں کا نام تھا۔

"خالو جان قانونی" میں نے فوراً مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"بسم اللہ عزیزم بی کے بٹالہ ——" جواباً خالو جان نے بھی مجھ سے مصافحہ کیا۔ غالباً جندوڈے نے اپنے رقعے میں میرا تذکرہ کیا ہوگا۔

"بے حد خوشی ہوئی آپ سے مل کر ——" خالو جان قانونی نے اپنی پتلی پتلی نکیلی اور مڑنے والی انگلیاں میری انگلیوں میں پھنسا کر کہا۔ "عزیزم جندوڈے کے ساتھ دشمنوں نے

کیا کارروائی ڈالی ہے۔ کچھ اس پر بھی اظہارِ خیال فرمائیں ؟"

میں نے مختصراً بیتی بات خالوجان کے گوش گذار کر دی۔ یہ سنتے ہی وہ ایک دم طیش میں آکر اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بولے۔" فلم دیکھنا کس قانون کے تحت جرم ہے عزیزم۔ ذرا یہ تو مجھے بتائیں۔؟"

میں نے کہا" یہ تو میں نہیں جانتا البتہ یہ ضرور جانتا ہوں کہ پولیس ایکٹ کا استعمال کسی ٹھوس جواز کی بنا پر کرتی ہے۔"

"سارا کیس غلط لڑ رہے ہیں آپ ــــ" خالوجان نے گرج کر کہا ــــ "اس کیس میں یہ دفعہ لاگو نہیں ہوتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ کا وکیل کون ہے ؟"

"میں ہوں ان کا وکیل ــــ" وکیل نے سائبان میں داخل ہوتے ہوئے کہا "فرمائیے"

"آپ کا نام ــــ" اچانک خالوجان قانونی نے اُٹھ کر مصافحے کے لیے نیزے کی طرح اپنا بازو وکیل کی طرف بڑھایا۔ وکیل نے اس وار کو اپنی مٹھی سے روک لیا۔ بولا ــــ

"سردار عبدالوکیل" ــــــــــ

"ولد ــــ؟" خالوجان نے جرح کے انداز میں پوچھا

"سردار عبدالجلیل ــــــ" وکیل نے حیرت سے خالوجان کا منہ دیکھا

"عزیزم عبدالوکیل ــــــ" خالوجان نے کھنکار کر کہا "بعد سلام کے واضح ہو کہ آپ غلط کیس لڑ رہے ہیں ــــــ

"کیا مطلب ؟" وکیل نے بھویں سکیڑیں۔

"مطلب یہ ہے کہ عزیزم فلم دیکھنا کوئی جرم نہیں۔ میں جب کبھی کسی مقدمے کی پیشی

بھگتنے آتا ہوں، فلم ضرور دیکھتا ہوں۔ یہ سائنس کی ایک زبردست ایجاد ہے" خالوجان نے وضاحت کی ــــ "اب آپ اگر مجھے اس جرم میں پکڑ کر ــــ" وکیل نے ان کی بات کاٹ دی۔ بولا۔"یہ دوسری قسم کی فلم تھی"

"کس قسم کی" ؟ خالوجان نے پُرتجسس لہجے میں ذرا آگے ہو کر پوچھا۔

"عزیزم۔ میرے ساتھ قانونی پیچیدگیاں نہ ڈالیں۔ صاف بات کریں"۔

وکیل کو اور بھی بہت سے کام تھے۔ اس بحث مباحثے سے گھبرا کر مجھ سے کہنے لگا۔ آپ ان بزرگوار کو اطمینان سے بیٹھ کر ساری تفصیل بتا دیں ایف آئی آر کی نقل بھی دے دیں تاکہ یہ اچھی طرح اپنی تسلی کر لیں"۔

میں نے خالوجان کی خدمت میں فی الفور وہی کالی، بھدی، ڈراؤنی اور پریشان کن نقل پیش کر دی۔ پہلے تو وہ اسے اُلٹا گھما کر دیکھتے رہے۔ پھر کاغذ کو سیدھا کیا۔ دھوپ میں لے جا کر سورج کی طرف کاغذ کا رُخ کیا اور خاصی دیر سر کھپانے اور پسینہ نکلوانے کے بعد اس انکشاف کے ساتھ واپس آئے "عزیزم بی کے بٹالہ۔ آپ اپنے وکیل کے خلاف کیس لڑنے کی تیاری کریں ــــ"

"وہ کس خوشی میں ؟" میں نے جل کر کہا۔" کیا اسی خوشی میں کہ وہ جندوڈے کو قید سے رہائی دلانے کی جدوجہد کر رہا ہے ؟"

"جی نہیں ــــ" خالوجان نے کڑک کر کہا ــــ "بلکہ اس بنا پر کہ وہ آپ کا کیس بگاڑ رہا ہے۔ اسے یہ کیس لڑنا چاہیئے کہ سارا الزام جھوٹا ہے۔ جب کہ اس کے برخلاف وہ اس بات کو تسلیم کر رہا ہے ــــ"

"آپ تھوڑا صبر کرلیں ——" سائیں جو بہت دیر سے جھنجھلایا بیٹھا تھا بھنّا کر بولا۔ صبح سے ہم خوار ہو رہے ہیں اور اب آپ پہنچ گئے ہیں سارا معاملہ چوپٹ کرنے ——"

خالوجان سہم کر ذرا پرے ہو گئے۔ سرگوشی میں پوچھا۔ "آپ کی تعریف ——؟"

"سائیں اللہ رکھا مستانہ" سائیں نے بھاری آواز میں کہا —— "آپ کے بھانجے یا بھتیجے کا ضامن —— آئی سمجھ ——؟"

خالوجان نے نیا نکتہ اُٹھا لیا۔ چمک کر بولے۔ "اس کیس میں ضمانت کا کیا مطلب کوئی قتل، اغوا، یا چوری کا کیس تو نہیں —— رہی بات ضامن کی تو بندہ حاضر ہے ——"

"بہت بہت شکریہ ——" سائیں اُٹھتا ہوا بولا —— "آپ آ ہی گئے ہیں تو سنبھالیں سارا معاملہ —— میں جا کر اپنا ہوٹل سنبھالتا ہوں ——"

اس سے پہلے کہ میں اسے روکتا یا ٹوکتا، سائیں اپنی جائیداد کے کاغذ پلاسٹک کے لفافے میں ڈالتا ہوا یہ جا وہ جا ——

اسی وقت وکیل نے آ کر کہا۔ "ہاں جی چلیں۔ آواز پڑ گئی ہے۔ ضامن کہاں گیا ——؟"

"ضامن کو میں نے رخصت کیا ہے عزیزم ——" خالوجان نے اُٹھتے ہوئے کہا آپ مجھے لے چلیں، جس جگہ لے چلنا ہے ضمانت میں دوں گا ——"

"آپ کی جائیداد ہے ——؟" وکیل نے چلنے سے پہلے پوچھا۔

"اللہ کا فضل ہے۔ کھیت، حویلی، مال، مویشی ہر چیز موجود ہے۔"

"اس کے کاغذات ——؟"

اس سوال پر خالوجان چلتے چلتے رُکے —— بولے "عزیزم —— کاغذات کی کیا

ضرورت ہے کیا شریف آدمی کی زبان کا کوئی اعتبار نہیں ——"

"عدالت ثبوت مانگتی ہے جناب ——" وکیل چڑ کر بولا —— "جب آپ کے پاس کوئی ثبوت ہی نہیں تو ضمانت آپ کس طرح دے سکتے ہیں۔ اچھا بھلا ایک شریف آدمی ضامن بن کر آیا تھا، آپ نے بحث اور جرح کر کے اسے بھی بھگا دیا —— اب میں کیا کروں؟"

اس پر خالوجان نے چپ سادھ لی اور اپنی پتلی پتلی مہندی رنگی مونچھوں کے کنارے ٹٹولنے اور مروڑنے لگے ——

عدالت نے تین روز بعد پیشی کا حکم دیا۔ پولیس کی گاڑی جنید وڈے اور دوسرے لوگوں کو لے کر جوڈیشل جیل چلی گئی —— اس معاملے میں خالوجان نے بعد میں اس طرح تبصرہ کیا —— "شکر ہے مہلت مل گئی۔ اب میں نہایت آرام سے گاؤں جا کر جائیداد کے کاغذات ڈھونڈ سکتا ہوں ——"

"اب آپ کا کیا پروگرام ہے عزیزم ——" انہوں نے کچہری سے باہر نکل کر مجھ سے پوچھا

"فی الحال تو میں اپنے کمرے میں جا کر غسل کروں گا اور پھر آرام کروں گا، آپ میرے مہمان بننا چاہیں تو زہے نصیب ——"

"انشاء اللہ ——" خالوجان نے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کی یہ حسرت پوری کر دوں گا عزیزم بی کے بٹالہ —— مگر فی الحال مجھے جانے دیں۔ تاکہ عزیزم جنید وڈے کے والدین کو تسلی دوں۔"

میں نے اصرار کر کے انہیں کھانا کھلایا۔ کچہری کی کینٹین کا بدذائقہ اور بے رنگ و بو کھانا کھا کر انہیں سخت تاؤ آیا۔ بولے۔ "اسی لیے تو میں کبھی کچہری میں کھانا نہیں کھاتا۔

یہاں ہر پلیٹ سے ایف آئی آروں اور مسلوں کی مہک آتی ہے "۔

دو تین روز بعد آنے کا وعدہ کر کے خالو جان قانونی رخصت ہوئے ۔ پیشی کے دن خالو جان قانونی کے ہمراہ ایک اور شخصیت احاطہ کچہری میں موجود تھی ۔ بھاری بھر کم وجود پر اوور کوٹ ۔ لٹکی ہوئی مونچھیں گول آنکھیں ۔ کندھے پہ چار خانوں والا رول ۔ سر پہ گول ٹوپی، ترکی ٹوپی سے ملتی جلتی ۔ جس کا پھندنا سر کی ہلکی سی جنبش سے فوراً ہلنے لگتا تھا ۔

"عزیزم پروفیسر بی کے بٹالہ ——" خالو جان نے لپک کر میرا بازو پکڑ لیا ۔ اور شخص مذکور سے میرا تعارف کروایا ۔ "حاجی ملک اللہ وسایا خان بے خود حکیم حاذق ۔ والد محترم عزیزم چند وڈا خاں "

میں نے جھک کر حکیم صاحب کو سلام کیا اور عاجزانہ انداز میں دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا ۔

"برخوردار سعادت اطوار ——" حکیم صاحب نے میرے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "برخوردار چند وڈے کے ذریعے آپ سے غائبانہ تعارف تو کافی عرصے سے تھا ۔ ملاقات اب ہو رہی ہے اور غلط جگہ ہو رہی ہے ۔ آئندہ احتیاط کریں ——"

"جی بہت بہتر ——" میں نے کچھ سوچے سمجھے بغیر سر ہلا دیا ۔

"مقدمے بازی کوئی اچھی چیز نہیں ——" حکیم صاحب نے مزید فرمایا ۔ آدمی کو اس سے پرہیز ہی کرنا چاہیئے ۔ میں برخوردار چند وڈے کی سرگرمیوں کے بارے میں فکرمند ہوں اسے آپ جیسے عاقل و بالغ دانا و بینا پروفیسر کی قربت حاصل ہے ۔ پھر کیا وجہ ہے کہ وہ جیل پہنچا ۔ ظاہر ہے کہ اسے اس چیز کی طرف راغب کیا گیا ہوگا ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کی صحبت کے علاوہ بھی اس پہ اور کسی کی صحبت کا اثر ہے ۔ یہ پیچیدگی دور کریں برخوردار ——"

میں نے لجاجت سے کہا "جناب والا ۔ چند وڈا خود عاقل و بالغ ہے ۔ اس کے ننانوے فی صد فیصلے اس کے اپنے ذہن کی پیداوار ہوتے ہیں ۔ ایک فی صد کی گنجائش اس باہر آدام کی سہولت کے لیے رکھ دی ہے ۔ آپ خود غور فرمائیں کہ ننانوے فی صد پہ ایک فی صد کو کیا فوقیت حاصل ہو سکتی ہے "

حکیم صاحب نے میری بات سنی ان سنی کرتے ہوئے میری نبض دیکھنی شروع کی ۔ پھر میرے پپوٹے اٹھا کر آنکھوں کا جائزہ لیا ۔ میرا پیٹ دبایا ۔ پیٹھ پر دو دھموکے جڑے ۔ زبان نکالنے کا حکم دیا ۔ آخر فیصلہ صادر کر دیا " برخوردار ! آپ کو یرقان ہونے والا ہے ۔ عنقریب آپ اس مرض کا شکار ہو کر بستر سے لگ جائیں گے ۔ آپ کا سارا خون پانی بن جائے گا ۔ جس چیز کو چھوئیں گے، پیلی ہو جائے گی ۔ عزیز و اقارب آپ سے کنی کترائیں گے ۔ آپ کی جان عذاب میں آجائے گی "۔

یہ سن کر میری سٹی گم ہو گئی ۔ آنکھوں کے سامنے ترمرے ناچنے لگے ۔ زمین پیروں کے نیچے سے سرکنے لگی ۔

یہ کیفیت دیکھ کر حکیم صاحب نے ایک قہقہہ لگایا، میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے " آئندہ احتیاط کریں، سبزیوں کا جوس اور گنے کا رس استعمال کریں، دھوپ میں نہ پھریں ۔ اور فضول فلمیں نہ دیکھیں " یہ کہہ کر انہوں نے اوور کوٹ کی جیبیں ٹٹولیں، کھنکھناتی ہوئی مختلف شیشیاں برآمد ہوئیں ۔ ایک بار پھر انہوں نے اوور کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا ۔ اب کے ایک بلی کی دم ہاتھ میں آئی جسے پچکارتے ہوئے انہوں نے باہر کھینچا ۔ بلی کے اگلے پنجوں میں کاغذات کے ٹکڑوں کا ایک بنڈل دبا ہوا تھا ۔ یہ پڑیاں بنانے والے کاغذات تھے ۔

حکیم صاحب نے کھڑے کھڑے میرے لیے دو دن کی خوراک تیار کی اور پڑیاں باندھ کر میرے حوالے کیں۔ پھر ہر پڑیا پر ترتیب کے مطابق صبح، دوپہر، شام، رات لکھنا شروع ہی کیا تھا کہ عدالتی کارروائی کی آواز پڑ گئی۔

مجسٹریٹ نے معقول ضمانت پر گرفتار کنندگان کی رہائی کا حکم صادر کر دیا۔ یہاں سے ہم عدالتی حکم کی نقل لے کر دس میل دُور جوڈیشل حوالات پہنچے۔ معلوم ہُوا ملاقات کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ اب رہائی کا پروانہ شام چار بجے کار آمد ہوگا۔

دو بجے دوپہر سے چار بجے سہ پہر تک خالو جان قانونی اور حکیم صاحب نے مجھے اپنی میزبانی کا موقع عطا فرمایا۔ اس عرصے میں دونوں بزرگوں کے مابین بعض معاملات پر گرم و سرد جملوں کا تبادلہ بھی ہُوا۔

آخر دونوں بزرگ اظہار ناراضگی کے طور پر ایک دوسرے کی طرف پیٹھ موڑ کر بیٹھ گئے اور باری باری دونوں نے مجھے مخاطب کرنا شروع کیا۔

"عزیزم بی کے بٹالہ" خالو جان کہتے — "ذرا میرے سامنے آئیں"

"برخوردارِ من" حکیم صاحب چیخے "پہلے میری بات سُنیں —"

"عزیزم! پہلے میری بات سُنیں۔"

"برخوردارم — پہلے میری بات سُنیں"

"عزیزم، آپ نے سُنا نہیں —"

"برخوردارم، ذرا ادھر دیکھیں"

"عزیزم، آپ نے سُنا نہیں"

"برخوردارم، آپ آئے نہیں۔"

اس عزیزم، برخوردارم میں شام کے چار کب بجے اور جندوڈا باہر آ کر مجھ سے گلے کب ملا، مجھے کچھ یاد نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ دونوں بزرگ گلے ملنے میں پہل کرنے کے لیے اسے اپنی اپنی طرف کھینچ گھسیٹ رہے تھے۔

"برخوردار — میں تمہارا والد ہُوں۔ پہلے مجھ سے گلے مل کر معافی مانگو"

حکیم صاحب نے جندوڈے کا ایک بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہُوئے کہا۔

"عزیزم — میں تمہارا خالو ہُوں — تمہارا ہونے والا سُسر — مجازی والد — پہلے مجھ سے مِل کر معافی مانگو —"

"برخوردار — خبردار — پہلے اِدھر آؤ — حکیم صاحب چیخے —

"عزیزم — ہوش کرو۔ کہاں جا رہے ہو — زور لگاؤ — اِدھر آؤ —"

خالو جان نے چیخ کر کہا۔

"حد ہو گئی جندوڈے۔ خبیث — بدبخت — میں تمہارا والد ہُوں۔ حقیقی والد۔"

حکیم صاحب نے اس کا بازو مزید قوت سے اپنی طرف کھینچتے ہُوئے کہا۔

"ادئے جندوڈے۔ بدتمیز — میں تمہارا ہونے والا سُسر ہوں" خالو جان دہاڑے۔

اب یہ عزت کا سوال ہے۔ پہلے تمہیں مجھ سے ملنا پڑے گا۔"

"میں تمہیں عاق کر دوں گا" حکیم صاحب گرج کر بولے۔ "خبردار۔ اگر میری نافرمانی کی —"

"میں تمہاری منگنی توڑ دوں گا —" خالو جان غرّائے۔ "ایک سیکنڈ بھی نہیں

لگاؤں گا۔"

"اوئے جندوڈے — بیہوش پُتر — میں تیرا عاق نامہ اخباروں میں چھپوا دوں گا ——"، حکیم صاحب نے حلق پھاڑا۔

"میں تمہاری منگنی کے خاتمے کا اعلان پنچائت میں کر دوں گا۔" خالوجان نے سعدے کا زور لگا کر کہا۔

"آجاؤ ادھر ——" حکیم صاحب نے آخری جھٹکا دیا —

"ادھر آؤ عزیزم ——" خالوجان نے تلوے زمین میں گاڑ کر زور لگایا۔

"ہئی شاباشے —" جندوڈے نے ہکا بکا ہو کر نعرہ لگایا۔ "ہئی شاباشے" —

اور یہ کہتے ہی دھڑام سے نیچے آ گرا۔

"یا اللہ خیر ——" حکیم صاحب کے چھکے چھوٹ گئے۔

"یا اللہ — مدد —" خالوجان گڑگڑائے۔

ارد گرد بھیڑ جمع ہو گئی۔

"کیا ہُوا —— کیا ہُوا —؟" ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں۔

"بندہ مار دیا ——" کسی نے چیخ کر کہا۔

جائیداد کا جھگڑا لے ڈوبا ——" دُوسری آواز آئی۔

"خاندانی دشمنی نے کام تمام کر دیا۔" تیسری آواز آئی۔

"پولیس ——" ایک شخص چیخ کر بولا۔

"ڈاکٹر ——" دوسرے نے حلق پھاڑ کر نعرہ لگایا۔

"پولیس ——" وُہی شخص دوبارہ چیخا —

"ڈاکٹر ——" دُوسرے نے دوبارہ ہانک لگائی۔

"پولیس ——"

"ڈاکٹر ——"

اچانک جندوڈے نے آنکھیں کھول دیں۔ ہڑبڑا کر کپڑے جھاڑتا ہُوا اُٹھ بیٹھا پھر حیران نظروں سے مجمع کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے چین کے شہزادو —" اس نے حیرت سے کہا۔ "آپ لوگ کس بات پر پریشان ہیں۔ یہ تو ہمارے خاندانی جھگڑے ہیں۔ روز ہی ہوتے ہیں —— ہوتے رہیں گے ——"

یہ کہہ کر اس نے پہلے حکیم صاحب کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر سر تسلیم خم کیا اور پھر ڈرامائی انداز میں ان سے لپٹ گیا۔ "مجھے معاف کر دیں ابا جی — مجھے معاف کر دیں — آئندہ میری توبہ ——"

"شاباش —" حکیم صاحب نے اس کے سر پر دستِ شفقت پھیرا۔ سعادت مند اولاد کو ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ اب تم کچھ عرصے کے لیے ہمارے ساتھ گاؤں چلو — تاکہ تمہارا قصہ بھی پاک کیا جائے۔ چلو اب اپنے خالوجان سے معافی مانگو —"

جندوڈے نے خالوجان کے پاؤں چھوئے۔ ان کے گلے لگ کر معافی مانگی اور جب ان سے الگ ہونے لگا تو وہ سرگوشی میں بولے۔ "عزیزم آئندہ ایسی غلطی

بھی نہ کرنا۔ ویسے اس فلم کا نام کیا تھا اور کس ہوٹل میں چل رہی تھی۔ اگلے مہینے
ایک مقدمے کی پیشی میں مجھے یہاں آنا ہے۔ ذرا پتہ اچھی طرح سمجھا دو ——"



وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

ایڈونچر بھمبھیریاں والی





موضع بھمبھیریاں والی کے آسمان پر کوّے اُڑ رہے تھے اور شام کی گرد آلود، دھوئیں دار فضا ان کی کائیں کائیں سے گونج رہی تھیں۔

تانگے والے نے نہر کے کنارے پہنچ کر تانگہ روکا، میرا بیگ اتار کر نیچے رکھا، اور اشارے سے نہر پار نظر آنے والی بستی کی طرف ہاتھ اُٹھا کر بولا "وہ رہا آپ کا بھمبھیریاں والی۔ پُل خراب ہے ورنہ میں آپ کو تانگے پر چھوڑ آتا۔"

میں نے اس کی انسان دوستی کا شکریہ اور کرایہ دونوں چیزیں ایک ساتھ ادا کیں اور بیگ اُٹھا کر نہر کے پُل کی طرف بڑھا۔ لیکن پُل کے پاس پہنچ کر مجھے ایک جھرجھری آئی۔ اس خستہ و خراب درماندہ حال پُل کی چولیں ڈھیلی ہو چکی تھیں، اینٹیں ہل رہی تھیں اور لوہے کے سریے زنگ آلود ہو کر جگہ جگہ سے یا تو جھک گئے تھے، یا ٹوٹ گئے تھے۔ گاؤں کے بائیوں نے پُل کے آر پار کھجور کے پیڑوں کے ٹکڑے کاٹ کر رکھ دیئے تھے، جن پر سے گذر کر وہ آتے جاتے تھے۔ مگر اس وقت پل پر کوئی نہیں تھا اور پیڑوں کے تنے آپس میں ملے ہوئے نہیں تھے۔ چھدرے تھے اور ایک دوسرے سے اتنے فاصلے پر تھے کہ آدمی ایک شہتیر سے پھسلے تو بچنے کے لیے دوسرے شہتیر کی سلامتی خطرے میں نہ پڑا ہے۔

کچھ دیر تک میں شش و پنج کے عالم میں چُپ چاپ کھڑا نہر کے پانی کے شراٹے سُنتا رہا۔ پانی اگرچہ زیادہ گہرا معلوم نہیں ہوتا تھا مگر مجھے یقین تھا کہ مجھے ڈبونے کے لیے اتنا ہی پانی کافی تھا۔

ایک دھوتی پوش دہقان مجھے حیران اور مشکوک نظروں سے دیکھتا ہُوا قریب سے گذرا اور انتہائی بے اعتنائی اور بے خوفی سے پُل پار کرنے لگا۔ درمیان میں پہنچ کر وہ اچانک تیزی سے پلٹا اور تیز تیز چلتا ہُوا میری طرف آیا۔

"کہاں جانا ہے جوان ——؟" اس نے میرے قریب پہنچ کر پُوچھا۔

"وُہ سامنے بھمبیھریاں والی ہیں ——" مَیں نے بستی کی طرف اشارہ کیا۔

"تو چلے آؤ میرے پیچھے پیچھے ——" اس نے دہقانوں کے مخصوص اکھڑ لہجے میں کہا ——" سوچتے کیا ہو۔ یہ کوئی پُل صراط تو نہیں —— ہمارے تو بچے بھی اس پر سے بھاگتے ہُوئے گذرتے ہیں —— تُم ڈرتے ہو ——؟"

مَیں نے مناسب سمجھا کہ اس نازک موقع پر سچ بول دیا جائے۔ "ہاں —— مَیں کبھی ادھر آیا نہیں —— مجھے ایسے پُلوں سے گذرنے کا کوئی تجربہ نہیں ——"

اس نے ایک ہاتھ سے میرا بیگ اُٹھا کر اپنے کندھے پر جمایا دُوسرا ہاتھ مجھے پکڑایا کہنے لگا "پُل پار کرنے کا اصول یہ ہے کہ بندہ سامنے دیکھے۔ نیچے نہ دیکھے۔ چلتے چلو میری کنڈ دیکھتے ہُوئے۔"

مَیں نے لرزتے ہُوئے ڈگمگاتے قدموں سے کچھ فاصلہ طے کیا۔ ایک مرتبہ پھسلتے پھسلتے بچا۔ غالباً میرے حلق سے ایک دلدوز چیخ بھی نکلی ——

دہقان نے جھٹ تربیت یافتہ کمانڈوز کی طرح مجھے سنبھال لیا۔ بولا ——

"کُوکیں مت مارو —— ایک معمولی پُل پر تو تمہاری دہشت کا یہ حال ہے۔ پُل صراط پر کیا کرو گے ——؟"

مَیں نے نادم ہو کر قدم اچھی طرح جما کر قدرے بے خوفی سے چلنا شروع کیا۔

دہقان نے پُوچھا ——"کس کے گھر آئے ہو بھمبیھریاں والی میں —— مُندری والی کے گھر؟"

"مُندری والی کے گھر ——؟"

مَیں نے حیرت سے پُوچھا۔

"ہاں کیونکہ شہر سے جب کوئی باؤ آتا ہے سیدھا مُندری والی کے گھر جاتا ہے۔"

"وہاں کیا ہے؟" مَیں نے مزید حیرت اور معصومیت سے پُوچھا۔

"اس کی دو لڑکیاں ہیں اور دونوں تین تین مرتبہ اپنے خاوندوں سے طلاق لے چکی ہیں۔ شہر سے جب کوئی آتا ہے انہی کا گھر پُوچھتا ہے۔ مُندری والی کہتی ہے کہ اس کی رشتہ داری شہر تک پھیلی ہُوئی ہے۔ لہٰذا کوئی کسی کو کچھ کہتا نہیں، سمجھتے سب ہیں۔"

مَیں نے اپنے ذہن کی ڈائری کے یادداشتوں والے کالم میں موٹا موٹا لکھا ——

ویری ارجنٹ ——مُندری والی —— تین تین مرتبہ طلاق یافتہ۔ دو بے انتہا دلکش۔ خوبرو گداز اور اہم شخصیات۔ مزید معلومات جندوڈے سے —— کوئیک ایکشن ——"

پُل کا سفر بخیر و خوبی طے ہُوا۔

دہقان نے میرا بیگ ایک چبوترے پر رکھا اور جس راستے سے آیا تھا اسی پر

واپس پلٹا۔

مَیں نے اخلاقاً پُوچھا — "تم بھمبیھر یاں والی نہیں جا رہے تھے — ؟"

وُہ پل کا کچھ حصّہ پار کر چکا تھا۔ مُڑ کر ہنستے ہُوئے بولا "نہیں، مَیں تو چک تِن سو چھ جا رہا تھا۔ تمہیں مشکل میں دیکھ کر ادھر آ گیا — سیدھے چلے جاؤ تیسری گلی کا چوتھا مکان مُندری والی کا ہے — باہر تنور لگا ہُوا ہے۔ ویہڑے میں بیری کے دَرخت ہیں۔ یہ پکّی نشانی یاد رکھنا ——"

"شُکریہ — خضر صُورت بزرگ — اس خصوصی رہنمائی کا شکریہ —" مَیں نے دل ہی دل میں کہا اور بظاہر بلند آواز سے بولا — "بھائی جی، آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے مَیں حاجی ملک اللہ وسایا خان بخود۔ حکیم حاذق کا مہمان ہوں، ان کے لڑکے کی شادی میں آیا ہُوں —"

مگر اتنی دیر میں دہقان خاصی دُور جا چُکا تھا۔ میری آواز پل کے نصف حصّے تک بھی بمشکل پہنچی ہوگی۔ البتہ اس کے گونجدار قہقہے مجھ تک ضرور پہنچے۔ ان قہقہوں میں طنز بھی تھا تضحیک بھی۔ ترغیب بھی۔ تحریک بھی۔

مَیں نے کاؤ بوائے کی طرح بیگ اُٹھا کر کندھے پر رکھا۔ زمین پر پاؤں بجا کر جُوتوں کی گرد جھاڑی اور آگے بڑھا ——

سامنے استقبالیہ کمیٹی مستعد کھڑی تھی۔

جونہی مَیں نے قدم آگے بڑھائے وُہ سب کے سب بھونکتے ہُوئے مجھ پر جھپٹے۔ بعض کُتّوں کے تیور خطرناک نظر آتے تھے۔ ان کی غُراہٹیں بھی شہری کتّوں سے

مختلف تھیں۔ یہ محض بڑکیں نہیں تھیں۔ حملے کے الارم تھے۔ واضح اور صاف —!

مَیں نے دائیں بائیں نظریں گھما کر کسی غیبی امداد یا باڈی گارڈ کو تلاش کیا لیکن نہر کا یہ دوسرا کنارہ گاؤں سے خاصے فاصلے پر تھا اور وہاں تک میری آواز اگر لاؤڈ سپیکر کے فُل والیوم پر بھی نشر ہوتی تو شاید ہی پہنچتی۔

بھونکتے ہُوئے کتّوں نے دُمیں ہلا ہلا کر اور مُنہ سے جھاگ چھوڑتے ہُوئے عف عف کر کے میرے اوسان خطا کر دیئے۔ پگ تے پتلون کے مصنّف کی اپنی پتلون اس وقت خطرے میں تھی۔

کوئی بھی تیز نکیلا پنجہ یا آری جیسے تیز دانت اس کے پرخچے اڑا سکتے تھے۔ پتلون اور مصنّف دونوں غیر محفوظ اور غیر معتدل تھے۔ بھورے رنگ کا ایک خوفناک کتّا اس ہراول دستے میں سب سے آگے تھا اور یکلخت مجھ پر جھپٹ پڑنے کے لیے مضطرب اور بیقرار ہو کر بار بار اپنی پوزیشنیں بدل رہا تھا۔ اس کا فوری سدباب ضروری تھا۔

مَیں نے بڑی آہستگی سے سہج سہج اپنا بیگ کندھے سے اتارا اور یکلخت اس کے زمین پر گرتے ہی مورچہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔ اب ایک سمت سے حملے کے راستے قدرے مسدود ہو گئے تھے البتہ تین سمتوں سے حملے کے امکانات بڑھ گئے تھے۔

حملہ آور حسبِ توقع اور حسبِ توفیق تینوں کھلی ہوئی سمتوں سے آگے بڑھے۔ اب میرے لیے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ بیگ کو ہتھیار کی طرح چاروں طرف گھماؤں اور نرغہ توڑ کر نکل بھاگوں۔ چنانچہ مَیں نے بیگ لٹکانے والی لمبی بیلٹ کے کنارے دونوں ہاتھوں میں مضبُوطی سے پکڑے اور بیگ کے ساتھ

ساتھ خود بھی دائرے کی شکل میں گھومنا شروع کیا۔

کتے پہلے کبھی ایسے بداخلاق مسافر کے منہ نہیں لگے تھے۔ نہ انہیں اس فوری گروش کی کوئی اُمید تھی۔ لہٰذا وہ صورتِ حال کو سمجھنے بوجھنے کے لیے تھوڑا تھوڑا پیچھے ہٹے۔ اور پُراشتیاق نظروں سے میری اگلی کارروائی کا انتظار کرنے لگے۔ مَیں بیگ گھماتا، دُور دُور کہتا، دائرے کی وُسعت میں اضافہ کرتا ہُوا بستی کی طرف بڑھا دُور سے مجھے کوئی دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ کوئی آوارہ بگولہ رقص میں ہے۔

بیگ کے وزن اور مسلسل گردش سے میرے شانے اور انگلیاں درد کرنے لگیں۔ پسینے چھوٹ گئے۔ آنکھ تلے ساری بستی پہیے کی طرح گھومنے لگی۔ مگر ابھی خاصہ فاصلہ باقی تھا۔ کُتے ہر چند سہم گئے تھے، لیکن میرا پیچھا چھوڑنے اور بھنبھیریاں والی آنے کے قصور کو معاف کرنے کے لیے آمادہ نظر نہیں آتے تھے۔

یکایک میں بیگ سمیت چکرا کر گرا۔ کُتے اچھل کر دُور جا پڑے۔

زمین پر بیگ سمیت اوندھے منہ گرنے سے دماغ میں شرارے سے چھوٹ گئے ستارے ناچ اُٹھے۔ ہاتھ مُنہ، سر اور بال گاؤں کی مٹی میں لتھڑ گئے اس بے حُرمتی پر سچ مچ مجھے غصہ آگیا۔

"جہنم میں جائے جندوڈا اور اس کی شادی ــــ" مَیں وفورِ غیض میں بڑبڑایا کُتے بدک کر مزید پرے ہٹ گئے۔

مَیں ایک دم کتوں سے بے نیاز ہوگیا۔ اُٹھ کر اطمینان سے کپڑوں کی گرد جھاڑی۔ رومال نکال کر مُنہ پونچھا اور لاپرواہی سے بیگ اُٹھا کر اسے جھلایا اور کندھے

پر رکھ لیا۔

پھر بے اعتنائی اور بے خوفی خود پر مُسلط کی۔ دھڑکتے ہُوئے دل کو ڈانٹا۔ خود کو سمجھایا اور اللہ کا نام لے کر چل پڑا۔ کنکھیوں سے کیا دیکھتا ہُوں کہ باہم مشورے ہو رہے ہیں۔ مَیں چلتا رہا، کُتے کچھ دیر تک عف عف کرتے ہُوئے میرے پیچھے آئے۔ لیکن اس عف عف میں اظہارِ تاسف کی آمیزش تھی۔ شکار ان کی توقع سے زیادہ دلیر نکلا، یا پھر بے وقوف۔

پھر کُتے پیچھے رہ گئے اور کھیت شروع ہوگئے۔ اچانک ان کھیتوں سے ایک شخص درانتی لیے برآمد ہُوا۔

"حکیم حاذق" مَیں نے کسی متوقع خطرے کو بھانپ کر زوردار آواز میں کہا۔

"حاجی حکیم حاذق کا مہمان ہوں۔"

وُہ شخص مُسکرایا۔ درانتی والے ہاتھ سے اس نے ایک عدد کھُردرا مصافحہ کیا۔ بولا

"جی ست بسم اللہ۔ جی آیاں نوں۔ میں کریم بخش ہوں، جندوڈے کا ماموں زاد بھائی"

"مگر جندوڈے کی والدہ مغفورہ و مرحومہ کا تو کوئی بھائی ہی نہیں تھا۔" مَیں نے اپنی معلومات سے کریم بخش کو چونکانا چاہا

وُہ لاتعلقی سے ہنسا۔ آسمان کی طرف درانتی اُٹھا کر بولا۔ "اُوپر والا جانے ــ بہرحال جندوڈے سے ہماری دُور کی رشتہ داری ہے۔ آج کل دشمن داری ہے۔ کیونکہ یہ شادی ہماری مرضی کے خلاف ہو رہی ہے۔"

مَیں نے یُونہی پُوچھ لیا۔ "تمہاری مرضی کے خلاف کیا معنی؟"

بولا "معنی یہ ہُوئے کہ خالو جان قانونی نے بچپن میں اپنی لڑکی مجھ سے منسوب کی تھی — پھر مُکر گیا — یہ تو کوئی بات نہ ہُوئی کہ سارا بچپن ہم نے رل مل کر ساتھ گزارا جوان ہُوئے تو بڑوں کے فیصلے بدل گئے۔ بہرحال دفع کریں ان باتوں کو اور جیندوڈے سے میرا ذکر بھی نہ کریں۔ آئیں میں آپ کو اس کے گھر تک چھوڑ آؤں۔"

جب ہم باتیں کر رہے تھے تو کھیت کے پرلی طرف سے ایک اوڑھنی طلوع ہُوئی اور کھڑی فصل میں سے ایک قد آور، گوری، چٹی، قدرے بھاری جسم کی ایک عورت نکل کر دُوسری طرف چلی گئی۔ اس کا رُخ بستی کی طرف تھا۔ ہم دونوں نے کنکھیوں سے پہلے اس کی طرف پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

پھر ہم روانہ ہُوئے۔ کریم بخش نے میرا بیگ اُٹھانے کی آفر یا زحمت نہیں کی۔ یہ دیہی روایاتِ میزبانی پر میرا ایمان متزلزل کرنے کی پہلی واردات تھی۔ جسے میں نے حیرت سے دیکھا۔

"بہت خوفناک کُتّے ہیں یہاں۔" میں نے شکایت کی۔

"خیر، اتنے بھی خطرناک نہیں —" کریم بخش بولا — "یہ بندہ پہچان کے کارروائی ڈالتے ہیں۔ کاٹتے نہیں، محض دوڑاتے ہیں۔ کیونکہ بستی تک پہنچنے کے لیے کوئی ٹرانسپورٹ نہیں۔" ٹرانسپورٹ کے علاوہ گاؤں میں اور بھی چیزوں کا فقدان تھا۔ مثلاً بجلی — ہائی اسکول — اسپتال — عدالت — پاک ٹی ہاؤس — رائٹرز گلڈ — اکادمی ادبیات — پھر بھی یہاں لوگ آباد تھے اور برس ہا برس سے جی رہے تھے — مطمئن اور آسودہ —

راستے میں ناٹے قد، گول چہرے، بھوری فراسکٹ اور اندر دھنسی ہُوئی آنکھوں اور

پھولے پھولے گالوں والا ایک شخص ملا۔ اس کے ہاتھ میں دُنبے کی رسّی تھی اور دُنبہ اس کے پیچھے خراماں خراماں چلا آ رہا تھا۔ کریم بخش نے اسے دیکھتے ہی کلکاری ماری "واہ واہ چاچا دُنبہ — آؤ جی ست بسم اللہ — جی آیاں نوں — کدھر چلے ہو —"

"ذرا چک تن سو باٹھ کا خیال ہے۔ غلام حسین لوہار سے قرض وصول کرنے چلا ہُوں چاچا دُنبہ نے وہیں سے اُونچی آواز میں کہا۔ حالانکہ یہی بات وُہ قریب آ کر علیک سلیک کے بعد کر سکتا تھا۔ قریب آ کر اس نے دُنبے کی رسّی چھوڑ دی۔ اور مصافحے کے لیے سب سے پہلے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ لیکن بڑھانے سے پہلے واسکٹ پر اچھی طرح رگڑا۔

"ستے ای خیراں —" اس نے مجھ سے محتاط مصافحہ کیا۔ "آپ جناب کی تعریف مندری والی کے کوئی شہری رشتہ دار ؟"

میں نے جلدی سے کہا۔ جی نہیں — "حاجی حکیم حاذق کے بیٹے کا دوست — شادی کا مہمان —"

"ستے ای خیراں —" اس نے پھر مجھ سے مصافحہ کیا اور کریم بخش سے غلام حسین لوہار کی قرض نادہندگی اور وعدہ خلافی کی باتیں کرنے لگا۔ میں بظاہر خوش اخلاقی مگر لاتعلقی سے ان دونوں کے درمیان کھڑا رہا۔ جب ان کا سلسلۂ گفتگو کسی طرح ختم ہونے میں نہ آیا، تو میں ان کے درمیان سے نکل کر ٹہلنے لگا۔

یہاں کھیت ختم ہو گئے تھے اور گرد آلود خشک قطعۂ اراضی کے بعد گاؤں کے کچے پکے مکانات اور ان کے تنوروں سے اُٹھتا ہُوا دھواں نظر آ رہا تھا۔

گرد کے بادل اڑاتا ہُوا بھینسوں کا ایک جتھہ گذرا۔ پھر بکریوں کے ایک ریوڑ کی

ممیاہٹیں گونجیں۔ میں ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ جگہ مویشیوں کی گذرگاہ سے قدرے فاصلے پر تھی۔ اور اس بات کا بظاہر کوئی امکان نہیں تھا کہ جتھے کی کوئی مرکھنی بھینس یا ریوڑ کا کوئی جوشیلا بچڑا ضروری تفتیش اور تعارف کے لیے میری طرف آئے گا۔

لیکن میں یہ بھول گیا تھا کہ چاچا کی گرفت سے آزاد ہونے کے بعد دُنبے کے کیا ارادے ہیں اور کدھر کا قصد ہے۔

یہ قصد اور ارادہ مجھ پر اس وقت منکشف ہوا، جب چاچا دُنبہ اور کریم بخش کی ملی جُلی "خبردار۔ خبردار۔ بچنا۔ بچنا" سُنائی دی ——

مگر افسوس یہ آواز مجھ تک ایک ڈیڑھ سیکنڈ کی تاخیر سے پہنچی۔ پلے ہوئے طاقت ور دُنبے کی ٹکر پہلے پہنچی۔

یہ ٹکر کیا تھی، میری کمر پر ایک آسمانی دھموکہ تھا۔ جس نے زمین سے میرے پاؤں اکھاڑ دیئے اور مجھے نہایت آسانی سے آسمان پر اُچھال دیا۔ مگر آسمان نے مجھے وصول نہیں کیا اور واپس زمین پر دے پٹخا — فی الحال آسمان کو ایک دانشور کی خدمات درکار نہیں تھیں اس ناگہانی آفت اور غیر مطلوب ایکسرسائز کے بعد پگ تے پتلون کے مصنف کا بے ہوش ہو جانا ایک فطری امر تھا۔ اور قدرت کے کاموں میں بندے کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

کنپٹیوں میں سائیں سائیں کی آوازیں گونجنے اور آنکھوں تلے بے ہوشی کا اندھیرا چھا جانے سے پہلے البتہ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے چاچا نے دُنبے کی پیٹھ تھپکی ہے اور اس تعارفی کارروائی پر اسے مُبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا ہے "شاباش اچھا شگن ہے۔ اُمید ہے غُلام حسین لوہار سے رقم وصول کر لاؤں گا" کریم بخش کی ڈوبتی ہوئی آواز سُنائی دی —

"جندوڈے کو خبر کرنی ہے — مہمان کا حال بتائیے ——"

○

کئی اجنبی اور نامانوس چہرے مجھ پر جُھکے ہوئے تھے، لیکن ان درجنوں آنکھوں میں اودبلاؤ جیسی دو چندھی چندھی ہونقی اور آشنا آنکھیں جنہیں لالٹین کی زرد روشنی میں بھی پہچان سکتا تھا۔

یہ جندوڈے کی آنکھیں تھیں۔ مسرور، چمکدار اور فاتحانہ ——

"چین کے شہزادے، عظیم دانشور، میرے دوست پروفیسر بی کے بٹالہ ——" اس نے نعرۂ تحسین بلند کرتے ہوئے کہا —" ویل کم ٹو بھمبیریاں والی — مُبارک ہو — تم بخیر و عافیت یہاں پہنچ گئے ہو — زہے نصیب — علامہ نے اس موقع پر کیا کہا ہے "

میں نے پہلو بدلنے کی کوشش کی۔ کمر میں درد کی ایک ہلکی سی لہر اُٹھی۔

"لیٹے رہو۔ لیٹے رہو —" جندوڈے نے دونوں ہاتھوں سے مجھے دبا کر دوبارہ لٹاتے ہوئے کہا۔ "تمہیں آرام کی سخت ضرورت ہے۔ ساری واردات میرے نوٹس میں آ چکی ہے۔ میں نے خالو جان قانونی کو مشورے کے لیے بُلوایا ہے۔ اباجی بھی پہنچ رہے ہیں"

"مم — میں ——" میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا "میں کہاں ہوں — تم کہاں ہو — یہ جگہ کون سی ہے ——"

"یہ ہمارے گھر کا مردانہ سیکشن ہے" جندوڈے نے بتایا "یہ مہمان خانے کی چھت ہے جہاں تم تازہ صحت بخش خالص ہوا کے مزے لوٹ رہے ہو۔ ابتدائی طبی امداد کے بعد تمہیں یہاں پہنچایا گیا ہے۔"

"میرا بیگ کہاں ہے؟" میں نے بوکھلا کر کہا۔

"نیچے ——" جندوڈے نے کہا "مہمان سرا کے توشہ خانے میں۔ اس کی طرف سے مطمئن رہو ——تمہارا کیمرہ بالکل محفوظ ہے۔"

تھوڑی دیر بعد سیڑھیوں میں ہٹو بچو کی آوازیں آئیں۔ پھر حکیم صاحب اوورکوٹ میں ملبوس اپنے عقیدت مندوں یا ماتحت عملے کے ساتھ نمودار ہوئے۔

ان کے لیے فوری طور پر ایک مونڈھا خالی کرایا گیا۔ جس پر آتے ہی وہ اپنے اوورکوٹ اور اس کی جیبوں میں بھری ہوئی شیشیوں اور بکیوں سمیت بیٹھ گئے اور مجھے مصافحہ کا شرف بخشا۔

"برخوردار پروفیسر بی کے بٹالہ ——" انہوں نے میری نبض ٹٹولتے ہوئے کہا۔ "خوش آمدید۔ اب آپ کے یرقان کا کیا حال ہے؟"

"آپ کی دعا ہے ——" میں نے بوکھلا کر کہا۔ اس کے سوا اور کوئی جملہ میری سمجھ میں نہیں آیا جو اس سوال کے جواب میں بولا جا سکتا۔

"برخوردار بٹالہ" انہوں نے میری نبض پر اپنی آہنی ناخن گڑوتے ہوئے کہا "آپ کا پتہ خراب ہو گیا ہے۔ افعالِ جگر و معدہ صحیح نہیں۔ پھیپھڑے اخراج و انجذابِ ہوا سے عاجز ہیں۔ حبس دم کی کیفیت ہے۔ یہ شکایت آپ کو کب سے ہے؟"

میں نے گذارش کی "کچھ ٹھیک یاد نہیں۔ غالباً ایک گھنٹہ پہلے تک ہر چیز درست تھی۔"

"آئندہ محتاط رہیں" انہوں نے میرا پیٹ دباتے ہوئے کہا۔ "احتیاط اچھی چیز ہے۔ حکیم بوعلی سینا، اللہ ان کی مغفرت کرے، ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ پرہیز علاج سے بہتر ہے۔ یہ کیا ہے۔؟" انہوں نے میری جیب میں رکھی ہوئی عینک کے سخت فریم پر دباؤ ڈال کر پوچھا "غالباً کوئی رسولی ——؟"

"جی نہیں —— میری عینک ——" میں نے جلدی سے کہا۔

حکیم صاحب اپنی جیبیں ٹٹولنے لگے اور مختلف جیبوں سے باری باری شیشیاں اور بکیاں نکالنے لگے۔ ایک بکی انہوں نے میرے سینے پر رکھ دی۔ تاکہ دواؤں کی تیاری کے دوران انہیں ڈسٹرب نہ کرے۔ دوسری بکی دم سے پکڑ کر انہوں نے جندوڈے کے حوالے کی۔

"برخوردار —— یہ غلط آگئی ہے۔ ہماری بکی سے بدل گئی ہے۔ جس کی ہو اسے دے آؤ اور ہماری بکی لے آؤ۔"

پھر انہوں نے پڑیاں بنانی شروع کر دیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ ازرہ شفقت فرماتے رہے۔ "برخوردار بٹالہ —— وجودی طور پر آپ بالکل نیست و نابود ہونے والے ہیں۔ آپ کا لکھا نہیں رہنا تھا۔ مگر اللہ کے فضل سے آپ صحیح وقت پر صحیح معالج کے پاس پہنچ گئے ہیں۔ اب انشاء اللہ —— آپ کا باقاعدگی سے علاج کیا جائے گا اور مکمل شفا تک شہر جانے کے سلسلے میں آپ پر پابندی عائد کر دی جائے گی۔ خدا مغفرت کرے حکیم عثمان فرمایا کرتے تھے کہ آرام علاج سے بہتر ہے اور علاج ضرورت افضل ہے۔" حاضرین و سامعین ٹکٹکی باندھے، دم سادھے حکیم صاحب کے ارشادات سن رہے تھے، اور فخریہ انداز میں سر ہلا ہلا کر ایک دوسرے کو ٹھوکے دے رہے تھے۔

اتنے میں جندوڈا بکی کا تبادلہ کرا لایا۔ حکیم صاحب نے بکی کا سرسری معائنہ فرما کر اسے گردن سے پکڑ کر جیب میں رکھنا چاہا کہ اس نے زقند بھر کے پنجہ مارا اور حکیم صاحب

کی گرفت سے نکل کر سیدھی سیڑھیوں کی طرف لپکی۔

حکیم صاحب نے بلی ناشناسی پہ جندوڈے کو ڈانٹا۔ بولے "آدمی کی پہچان کے ساتھ جانور کی پہچان بھی لازم ہے برخوردار — جو شخص جانور کو نہیں پہچان سکتا وہ آدمی کو کس طرح پہچانے گا، خیر، اس وقت موضوع دوسرا ہے، فی الحال کھانا لگواؤ۔ میں مریض کو لے کر نیچے پہنچتا ہوں۔"

اپنے لئے مہمان کی بجائے مریض کا خطاب سُن کر میں تلملایا۔ احتجاج کے لیے مُنہ کھولا ہی تھا کہ حکیم صاحب میرا مدعا بھانپ گئے۔ جھٹ ایک پڑیا کھول کر میرے مُنہ میں جھاڑ دی۔ بولے "مُنہ نہ کھولنا برخوردار — میں پانی منگواتا ہوں — مگر پہلے آپ اس انگریز لیفٹیننٹ کی روئیداد سُن لیں جو انگلینڈ سے چل کر میرے پاس بغرضِ علاج آیا تھا"

کھانا جب نیچے مہمان سرا میں فرشی نشست پر لگ چُکا تو حکیم صاحب زنان خانے کے لیے رُخصت ہُوئے اور مجھے اگلے دن اپنے مطب میں حاضر ہو کر معائنہ کروانے کا حکم دیا۔ اس کے ساتھ ہی تقریباً آدھی بھیڑ بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ بچے کھچے حضرات کو یہ کہہ کر فارغ کر دیا گیا کہ مریض کو آرام کرنے دیا جائے۔ کیونکہ اس کی حالت نازک ہے اور کچھ عجب نہیں رش کی زیادتی کی وجہ سے اس کی حرکتِ قلب بند ہو جائے۔

بھیڑ کائی کی طرح چھٹ گئی۔

ہم کھانے پر بیٹھے تو احاطہ کے چوڑے دروازے سے ایک سائیکل اُچھل کر اندر داخل ہُوئی۔ پھر کوئی دھڑام سے گرا۔ اور سائیکل ایک طرف کھڑی کر کے کپڑے جھاڑتا ہُوا اندر آیا۔

یہ بلاشبہ خالو جان قانونی تھے۔

انہوں نے آتے ہی بڑی گرمجوشی سے مصافحہ و معانقہ کیا۔ اور چٹکی بجا کر بولے

"عزیزم جندوڈا خان — تمہارا مسئلہ حل ہو گیا — میں منشی بشارت سے مل کر آرہا ہوں۔"

میں نے پُرتجسس انداز میں خالو کی طرف دیکھا۔

"منشی بشارت —" خالو جان قانونی نے بتایا۔ "میرے بعد اس گاؤں کا نمبر ون ماہر قانون ہے۔ میں اس کے پاس دُنبے کی ٹکر والا معاملہ لے کر گیا تھا۔ اب یہ کیس شہر کی سول عدالت میں جائے گا۔"

میں نے بھوئیں سکیڑ کے "کیا مطلب" والا انداز بنایا۔

"اس کے کئی قانونی فوائد ہوں گے۔" خالو جان نے کہا "پہلی بات تو یہ ہے کہ عدالت کوئی ایسا قانون پاس کر دے گی کہ ٹکر مارنے والے دُنبوں کے مالکان کے لیے لائسنس لینا ضروری ہو۔ اس قسم کے دُنبے یقیناً ہتھیار کی تعریف میں آتے ہیں اور کوئی ہتھیار لائسنس کے بغیر اپنے پاس نہیں رکھا جا سکتا۔ عزیزم، یہ قانونی نکتہ ہے۔ اور ہم سارا کیس اسی نکتے پر لڑتے جا رہے ہیں۔"

میں نے برسبیلِ تذکرہ پُوچھ لیا "سردست چاچا دُنبہ کے خلاف کیا کارروائی کی جا رہی ہے۔"

خالو جان نے بتایا "فی الحال ہم نے اس کا دُنبہ قبضے میں لے لیا ہے۔ اس وقت ہمارے گھر مال مویشیوں کی کوٹھڑی میں آپ کی خالہ جان صاحبہ اس کی نگرانی پر مامور ہے عزیزم وہ بڑی جی دار عورت ہے۔ اس کے ہوتے ہُوئے ہمارے گھر کی طرف پرندہ بھی

پرواز نہیں کر سکتا۔ کسی مائی کے لال میں یہ جرأت نہیں کہ وُہ دنبہ نکال کر لے جائے۔
کبھی غریب خانے پر تشریف لا کر اپنی خالہ جان صاحبہ سے مل لیں۔ جی خوش ہو جائے گا۔"

میں نے وعدہ کیا کہ بشرطیکہ عرصہ و مہلتِ قیام، میں جی دار خالہ جان صاحبہ سے مل کر ضرور ان کی جی داریوں کو خراجِ تحسین پیش کروں گا کیونکہ ایسی نادرالوجود چیزیں دُنیا میں کم ہیں۔

ہم کھانے سے فارغ ہُوئے ہی تھے کہ دست پنجہ صاحب پہنچ گئے۔ یہ جنود و دے کے پھوپھا تھے۔ کسی زمانے میں کبڈی کے بڑے شوقین تھے۔ آج کل منیاری کی دکان کھول رکھی تھی اور گاؤں کی خواتین میں چوڑیاں، پراندے، سُرخی پاؤڈر اور اسی طرح کی دیگر زنانہ مصنوعات بیچتے تھے۔

انہوں نے آتے ہی مجھ سے پنجا ڈال دیا۔ اپنی اُنگلیوں میں میری اُنگلیاں پھنسا کر مصافحہ کیا اور ایک جھٹکا دیا۔ میں اُچھل کر ان سے ٹکرا گیا۔ انہوں نے قہقہہ لگا کر میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ بولے "پھوکا فائر۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہُوئی۔ کبھی میری دکان پر آ کر مجھ سے دست پنجہ لڑائیں۔"

پھوپھا دست پنجہ کی ناگہانی آمد پر خالو جان قانونی کچھ سٹپٹا سے گئے تھے۔ ایکدم چُپ ہو گئے۔ گویا سانپ سُونگھ گیا ہو اور ہونٹ یوں بھینچ لیے جیسے انتہائی کڑوی دوا پی لی ہو ——

پھوپھا دست پنجہ نے انہیں دیکھ کر خیر مقدمی قہقہہ لگایا اور دست پنجہ لڑانے کے لیے ان کی طرف لپکے ——

خالو جان قانونی سمٹ کر دیوار سے جا لگے۔ بولے "عبدالرحیم، میرے دماغ میں اس وقت قانونی جنگ ہو رہی ہے۔ اس وقت مجھے مت چھیڑنا۔"

پھوپھا دست پنجہ غالباً ان سے بے حد بے تکلف تھے۔ کاندھے پر کھڑی ہتھیلی کا وار کر کے بولے "قانون کے علاوہ بھی کوئی جنگ سیکھ لو محرم خان، پہلے ہی تم کانگڑی پہلوان ہو ——"

"کون کانگڑی؟" خالو جان غرّائے۔

"تم —— اور کون" دست پنجہ صاحب نے انہیں مزید چھیڑنے کے لیے کہا۔

"برادرم عبدالرحیم ——" خالو جان قانونی نے تیز لہجے میں کہا۔ "یہ صاف دو ٹوک بتنگِ عزت کا کیس بنتا ہے۔"

"بنا لو۔ اگر بنتا ہے۔" دست پنجہ نے زبردستی ان کا ہاتھ پکڑ کر ان کی انگلیوں میں اپنی اُنگلیاں پھنسانے کی کوشش کرتے ہُوئے کہا۔

"مہمان کا خیال کرو۔" خالو جان اپنا ہاتھ چھڑاتے ہُوئے بولے "یہ ایک بڑی نازک مزاج ہستی شہر سے آئی ہوئی ہے۔ کیا سوچے گی۔"

"میدان نہ چھوڑا کرو۔" دست پنجہ صاحب نے جھلا کر کہا۔

یہ کہہ کر انہوں نے خالو جان کا ہاتھ اچھی طرح اپنی گرفت میں لے لیا اور پے در پے دو تین زوردار جھٹکے دیئے۔ متوقع جھٹکوں سے بچنے کا انتظام خالو جان نے پہلے ہی کر لیا تھا، یعنی اپنی کمر دیوار سے لگا لی تھی اور اپنی طرف زور لگا کر خود کو دیوار سے چپکائے رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن دست پنجہ صاحب کو ان کی عافیت مطلوب نہیں تھی۔ لہٰذا انہوں

تے کلائی مروڑتے ہوئے خالو جان کی کمر کا زاویہ ترچھا کیا اور ایک جھٹکے سے انہیں اپنی طرف کھینچ لیا ——

دونوں ایک دوسرے کے اُوپر اور بعد ازاں فرش پر گرے جس پر سے کھانے کے برتن ابھی نہیں اٹھائے گئے تھے۔ دیسی شیشے کے موٹے جگ اور گلاس، ان میں بھرا ہُوا پانی پلیٹوں میں بچا ہُوا شوربہ، چاول اور باقی ماندہ کھیر کا ڈونگہ، ان دونوں کی ضیافتِ طبع اور مزاج پُرسی کے کام آیا۔ دو جگ ٹوٹے۔ چھ گلاس پھُوٹے اور ان کی کرچیوں نے دونوں بزرگوں کی حالت ناگفتہ بہ کر دی۔

دونوں کھسیانی ہنسی ہنستے ہُوئے ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ جندوڈا سر پکڑے ٹوٹے ہُوئے برتنوں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتا رہا اور بڑبڑاتا رہا "کچھ نہیں چھوڑا چین کے شہزادو۔ کچھ نہیں چھوڑا تم نے"

○

ہم دونوں بھمبھیریاں والی کے تاروں بھرے آسمان کے نیچے، مہمان سرا کی چھت پر، پاس پاس چارپائیاں بچھائے لیٹے تھے۔ رات خاصی بیت چکی تھی، کیونکہ جس وقت ہمارے دانشور پاک ٹی ہاؤس یا شیزان میں شام کی چائے پینے کے لیے داخل ہوتے ہیں، موضع بھمبھیریاں والی میں آدھی رات گذر چکی ہوتی ہے۔

جندوڈا ایک ہاتھ چارپائی سے نیچے لٹکائے فرش پر دائرے اور لکیریں کھینچ رہا تھا۔ ایک دم چونک کر بولا "چین کے شہزادے۔ وہ تم نے ٹیلر ماسٹر نیاز محمد آرزو کا مکو نہیں ٹھپّا۔ کچھ بتایا نہیں اس کے بارے میں ——"

میں نے کہا "ایک دن اچانک وہ مجھے مل گیا تھا۔ میرے ساتھ اس وقت مست قلندر ہاتھی بھی تھا۔ میں نے نیاز محمد پر دھاوا بول دیا۔ ایک دم چڑھائی کر دی۔ وہ بوکھلا گیا۔ کہنے لگا خدا کی قسم میں تو ملک جندوڈا صاحب کے عقیدت مندوں میں شامل ہوں۔ مجھے کیا ضرورت پڑی تھی انہیں کسی چکّر میں پھنسانے کی۔ مس روبی اللہ دتہ نے مجھے کچھ پیسوں کا بندوبست کرنے کے لیے کہا تھا اسی چکّر میں مجھے دیر ہو گئی جب میں ہوٹل پہنچا تو اس پر تالہ لگ چکا تھا۔"

جندوڈا بگڑ کر بولا "مگر وہ کم سے کم تمہیں تو آ کر یہ اطلاع دے ہی سکتا تھا۔ کہ میرے ساتھ یہ سانحہ بیت گیا ہے۔"

"ہاں ——" میں نے کہا۔ "اس پر وہ بھی بہت نادم ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ مس روبی کے لیے پیسوں کا بندوبست کرنے کے بعد جب وہ اس کے گھر پہنچا، تو اس نے اسے آنے نہیں دیا۔ دراصل جندوڈے میری جان، اس میں نیاز محمد آرزو کا کوئی قصور نہیں، چلتر عورتوں کا جادو ہوتا ہی ایسا سریع الاثر ہے۔"

"کون سا اثر؟" جندوڈے نے سر اُٹھا کر کہا۔

"سریع الاثر ——" میں نے دہرایا۔

"س سے کہ ص سے۔" جندوڈا اپنے ذخیرہ الفاظ میں اضافے پر تُلا ہُوا تھا۔

"جس طرح تمہیں سہولت ہو ——" میں نے کروٹ بدل کر اکتاہٹ سے کہا۔ پھر آہستہ سے پُوچھا۔ "یہ مندری والی سرکار کون ہے؟"

جندوڈا ایک دم اُٹھ بیٹھا۔ آلتی پالتی مار کر اپنی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس وقت

اس کے ہیولے میں اور جنات کے سائے میں کوئی فرق نہیں تھا۔ چند لمحوں تک وہ مجھے گھورتا رہا۔ پھر بولا۔ "تمہیں کس نے بتایا؟"

"ایک راہ گیر نے"

"پوری تفصیل۔ چین کے شہزادے۔ پوری تفصیل۔ کیونکہ یہ بڑا نازک معاملہ ہے۔"

میں نے مختصراً راہ گیر دہقان سے اپنی ملاقات کا حال اسے کہہ سنایا۔ پل عبور کرتے ہیں جو مجھے مشکلات اور خطرات پیش آئے وہ بھی اس کے گوش گذار کر دیئے جندوڈے سے رہا نہ گیا۔ بولا "چین کے شہزادے میں نے تو اپنے خط میں صاف تمہیں مطلع کر دیا تھا کہ پل کے راستے نہ آنا۔ اسے تم جیسا دانشور آسانی سے عبور نہیں کر سکتا۔ اسی لیے میں نے مشورہ دیا تھا کہ لاری اڈے سے گاڑی کی طرف آنے والے کسی ٹریکٹر یا ٹرالی میں سوار ہو کر آجانا۔ یہ لمبا چکر کاٹ کے بستی تک پہنچتے ہیں۔ راستے میں نہر نہیں پڑتی۔ پھر تم نے تانگہ کیوں لیا؟"

میں نے اسے بتایا کہ لاری اڈے کی تیز دھوپ میں ٹین کی چھت کے نیچے گیلنوں کے حساب سے پسینہ نکلوانے کے بعد بھی جب مجھے گاؤں جاتا ہوا کوئی ٹریکٹر نہ ملا تو میں نے یہی مناسب سمجھا کہ ڈی ہائیڈریشن اور سفوکیشن سے بچنے کے لیے واحد دستیاب سواری پر اکتفا کروں۔

میری ڈی ہائیڈریشن اور سفوکیشن والی بات نے جندوڈے کو خاصا متاثر

کیا بولا: "ان دونوں موذی چیزوں سے بچ نکلنے اور زندہ سلامت یہاں تک پہنچنے پر ایک بار پھر میری دلی مبارک باد قبول کرو۔" یہ کہہ کر اس نے مجھ سے مصافحہ کیا اور رازداری سے بولا۔ "مندری والی۔ سرکاراں — مختاراں اور سرداراں — دو فتنۂ روزگار — نابغۂ عصر اور گار آمد ہستیاں —"

"ملاقات کی کوئی سبیل؟" میں نے فوراً پوچھا

"صرف دریائے نیل۔" جندوڈے نے کہا۔ "نہر کے کنارے اور وہ بھی اسی صورت میں جب ہر طرف سناٹا ہو — اور فصلیں نہ کاٹی جا رہی ہوں۔"

کچھ دیر تک ہم خاموش لیٹے تاروں بھرے آسمان کو دیکھتے رہے۔ پھر جندوڈے نے مجھے اطلاع دی۔ "خالو جان قانونی ان کا سخت مخالف ہے اور انہیں کئی مرتبہ گاؤں سے نکلوانے کی کوشش کر چکا ہے۔"

"ناکامی کی وجہ —"

"اصلی تے وڈی مندری والی — مائی بختیاراں —" جندوڈے نے بتایا۔ "وہ بڑی چالاک لومڑی ہے۔ کبھی پچھاڑ نہیں دیتی۔ بیٹیوں کی عیب پوشی کے ہنر میں اسے ملکہ حاصل ہے۔ پھر لڑنے جھگڑنے میں اس کا کوئی ثانی نہیں۔ دست پنجہ صاحب بھی اس سے پیچا لڑاتے ہوئے گھبراتے ہیں، چونکہ گاؤں میں کوئی لیڈی ڈاکٹر نہیں اور وہ واحد دایہ ہے جو شہر سے مڈوائفری کا کورس بھی پاس کر آئی ہے، لہٰذا لوگوں نے مجبوری کا نام شکریہ کے طور پر اسے برداشت کر رکھا ہے۔ بہرحال لعنت بھیجو — اس وقت ایک پراجیکٹ میرے دماغ میں گھوم رہا ہے — بلکہ دو پراجیکٹ ہیں، تم پوچھو کون کون سے؟"

پھر جندوڈا سنبھل کر بیٹھ گیا۔ بولا "اُٹھو کر بیٹھو چین کے شہزادے۔ یہ بڑے نازک معاملات ہیں۔ انہیں سرجوڑ کے طے کرنا ہے۔ نمبر ایک یہ کہ شادی میں ابھی دس پندرہ دن باقی ہیں۔ میں نے تمہیں اتنے دن پہلے اسی لیے بُلایا تھا کہ اکٹھے ہل بیٹھ کے پروگرام طے کیئے جائیں، اور علمی، ادبی اور ثقافتی میدان میں تباہیاں پھیر دی جائیں، ہل چلا دیئے جائیں، دُنیا دنگ رہ جائے۔ لہٰذا نمبر دو یہ کہ میری شادی سے دو دن پہلے اسی مہمان سرا کے احاطے میں ایک ورائٹی شو کا اہتمام کیا جائے گا، جس میں شہر کے فنکار اپنے فن کا مظاہرہ کریں گے۔ صدارت میری ہوگی اور مہمان خصوصی مس رُوبی اللہ دتہ ہو گی۔"

"اگر اس کے ساتھ کوئی کُرسی خالی ہو—" میں نے خیال انگیز لہجے میں کہا۔

"تو دوسرے مہمانِ خصوصی کو نہ بُھولنا۔ جو فی الحال تمہارے سامنے چارپائی پر بیٹھا ہے —"

"یہ بھی سوچ لیں گے۔" جندوڈے نے ناگواری سے سر ہلا کر کہا۔ "پہلے ضروری معاملات طے کر لیے جائیں۔ نمبر ٹو یہ کہ اس پُورے شو کی فلمبندی کی جائے گی۔ تمہارے کیمرے میں ریل لوڈ ہے۔ میں چیک کر چکا ہوں۔"

"میں نے تو اب تک اپنے بیگ کی صورت بھی نہیں دیکھی۔" میں نے حسرت سے کہا۔

"وُہ بھی دیکھ لوگے۔" جندوڈا میری بات کاٹ کر بولا۔ "چین کے شہزادے، کیا خیال ہے ہم اسے جندوڈا بیٹی فٹ شو کا نام نہیں دے سکتے۔؟"

"ہم اسے جندوڈا چیریٹی شو کا نام بھی دے سکتے ہیں۔" میں نے جواباً کہا۔ "مگر سوال یہ ہے کہ گاؤں کی اس مفلوک الحال آبادی میں کتنے لوگ ہیں جو ٹکٹ خرید کر یہ شو

دیکھنے آئیں گے۔ مجھے تو ایسی کوئی اُمید نظر نہیں آتی اور پھر سب سے بڑا مسئلہ فن کاروں کا ہے۔ وہ بغیر کسی معاوضے کے اتنی دُور آنے پر کس طرح اور کس لیے آمادہ ہوں گے؟"

"خیر—" جندوڈے نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "یہ پراجیکٹ ہم فی الحال التوا میں رکھتے ہیں، اور دوسرے پراجیکٹ پر بات کرتے ہیں۔ مشاعرے کے انعقاد کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"یہ نسبتاً قابل عمل ہے۔" میں نے فوراً کہا۔ "شاعر کو غزل سُنانے سے مطلب ہے بھیڑیاں والی ہو یا کاہنہ کاچھا، مرید کے ہو یا چیچو کی ملیاں، وُہ بلاچُون و چرا بیاض بغل میں داب کر غزل سُنانے پہنچ جائے گا۔ شرط یہ ہے کہ کھانا اچھا ہو اور معاوضہ معقول ہو۔"

جندوڈا ایک دم بستر پر ڈھے گیا۔ گہرا سانس لے کر بولا۔ "چین کے شہزادے معاوضے اور اخراجات والے پروگرام سر دست پھر کسی وقت کے لیے اُٹھا رکھو۔ اب پراجیکٹ نمبر ٹو کی طرف آجاؤ۔"

یہ کہہ کر وہ پھر بستر پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ جیب سے سگریٹ نکال کر سُلگائی ایک گہرا کش لے کر دھواں میرے منہ پر چھوڑا۔ پھر آسودگی کے خمار کے عالم میں کہنے لگا

"مختاراں اور سرداراں کئی مرتبہ مجھ سے کہہ چکی ہیں کہ میں انہیں فلم یا ٹی وی میں کام دلا دُوں تاکہ وُہ گاؤں کی گھٹی گھٹی فضا سے نکل کر شہر کی آزاد ہوا میں سانس لے سکیں اور چار پیسوں کے ساتھ شہرت اور عزّت بھی کما سکیں۔ میں حکیم صاحب کے ڈر سے اب تک خاموش تھا لیکن شادی کے بعد یہ ڈر دُور ہو جائے گا۔ تم وڈیو کے اسکرپٹ میں تبدیلی کرو۔ اور ایک کی جگہ دو ہیروئنوں کی گنجائش نکالو۔ مگر خیردار۔ ہیرو ایک ہی رہے گا"

اب مجھے نیند آنے لگی تھی۔ میں نے جماہی لے کر کہا۔ ٹھیک ہے۔ آپ کا کام ہو جائیگا"

جندوڈے کے اعصاب پر فلم سوار تھی مجھے جھنجھوڑتے ہوئے بولا "گاؤں کی عادتیں نہ اپناؤ۔ چین کے شہزادے۔ مجھے چکمہ نہ دو۔ میں جانتا ہوں کہ رات کے دو بجے سے پہلے تمہیں نیند نہیں آتی۔"

مگر جواباً اسے میرے خراٹے سنائی دیئے ہوں گے۔

○

صبح ہی صبح کسی نے میری چارپائی الٹ دی۔

میں دھڑام سے فرش پر گرا پڑا۔ بے ساختہ میری آنکھ کھل گئی۔ کیا دیکھتا ہوں۔ کہ چارپائی مجھ پر سوار ہے اور ساتھ کی چارپائی جندوڈے سمیت غائب ہے اور پاس ہی دس بارہ سالہ ایک شیطان صورت مخنی سا لڑکا لوٹا لیے دانت نکالے بھی کھی کر رہا ہے۔

"منہ ہاتھ دھولے اوئے" اس نے لوٹا تقریباً مجھ پر انڈیلتے ہوئے کہا۔ میں اگر جلدی سے سنبھال نہ لیتا تو لوٹا فرش پر گرتا۔

میں نے کینہ توز نظروں سے اس بیہودہ ملازم کو دیکھا۔ وہ دانت نکالے غور سے مجھے دیکھ رہا تھا بولا "اوئے جلدی کر جلدی — روٹی پئی ٹھنڈی ہوندی اے"

"ملک صاحب کدھر ہیں۔" میں نے اس کا حکم نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیہڑا ملک —" وہ حیران ہو کر بولا۔

"ملک جندوڈا خاں صاحب" میں نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔

"تیرے منہ نوں کوئی تکلیف اے؟" اس نے تشویش ناک لہجے میں پوچھا

پھر بتایا "ملک لالہ تھلے بیٹھا تیری انتظار پیا کردا اے۔ تے حاجک صاحب تے دی تینوں دوائی خانے وچ بلایا اے"

میں جلدی سے ہاتھ منہ دھو کر نیچے پہنچا — ناشتے پر جندوڈا میرا منتظر تھا — ایک صاحبِ حال درویش گلے میں منکوں کی کئی مالائیں پہنے بال بکھرائے ڈنڈا سامنے دھرے نظریں افق پر گاڑے بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ چھدری داڑھی والے ایک صاحب تسبیح پکڑے بیٹھے تھے۔ میں نے دونوں صاحبوں کو سلام کیا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ لیکن جندوڈے نے میری پنڈلی پر چٹکی لے کر مجھے بیٹھ جانے کو کہا۔

"پیر کرامت علی شاہ صاحب قبلہ —" اس نے منکوں کی مالاؤں والے بزرگ کی طرف اشارہ کیا۔ "روحانی استاد۔ قبلی رہنما، پہنچی ہوئی شخصیت — مولوی محمد صدیق خاکی صاحب" اس نے چھدری داڑھی والے بزرگ کی طرف اشارہ کیا۔ "امام مسجد۔ دینی مدرسہ کے منتظم اعلیٰ — روحانی شخصیت —" پھر اس نے اجتماعی اشارہ کیا "ناشتہ حاضر ہے۔ قبلہ وکعبہ شوق فرمائیں"۔

"اللہ ہو — حق حق ہے — حق حق ہے —" پیر صاحب نے لسی کا بڑا گلاس اٹھا کر نوش فرمایا — اور ڈکار مار کے اُنگلی آسمان کی طرف کھڑی کر دی۔

مولوی صاحب نے پراٹھے کے ایک بڑے لقمے کی تہہ میں کوئی آدھ پاؤ مکھن چپڑتے ہوئے کہا "دُنیا فانی ہے میرے محترم۔ سب کچھ یہیں رہ جانا ہے" یہ کہہ کر لقمہ نوش فرمایا اور لسی کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"فرمایا پیر مدارج نے" پیر صاحب نے نصف پراٹھے میں مرغ کی ٹانگ لپیٹتے

ہُوئے کہا: "دن اور رات کے چکر گناہگار بندوں کے لیے ہیں، پاک رُوحیں ان سے فارغ ہیں۔ توشۂ عافیت حق ہے۔ حق حق ہے — حق حق ہے — اللہ — ہُو"

یہ کہہ کر انہوں نے لقمہ نوش فرمایا اور بقیہ تصف پراٹھے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"میرے محترم —" مولوی صاحب نے مُنہ چلاتے ہُوئے کہا: "کچھ آپ بھی نوش فرمائیں —"

مَیں نے ڈرتے ڈرتے پراٹھے کا ایک کونا توڑا۔ آہستگی سے اسے منہ میں رکھا۔

مولوی صاحب ایک تلا ہُوا سالم انڈا لقمے کی تہوں میں لپیٹتے ہُوئے بولے "میرے محترم شہر میں کیا شغل فرماتے ہیں؟"

"ایک پرائیویٹ نائٹ کالج میں پروفیسر ہیں۔" جندوڈے نے تعارف کروایا۔

"افسوس کا مقام ہے —" مولوی صاحب نے سر ہلاتے ہُوئے کہا: "دنیاوی تعلیم، دینی تعلیم پر حاوی ہوتی جا رہی ہے۔ جدھر دیکھئے اسکول کھل رہے ہیں۔ کالج کھل رہے ہیں، بے حیائیاں عام ہو رہی ہیں۔ یہ سب قیامت کے آثار ہیں، تباہی و بربادی کی علامتیں ہیں۔ کیا فرماتے ہیں پیر صاحب قبلہ؟"

پیر صاحب نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ لسّی کا گلاس اُٹھا کر لقمۂ حلق سے نیچے اتارا۔ پھر کھنکھار کر بولے۔ "اس میں کیا شک ہے مولانا۔ حق حق ہے۔ حق حق ہے — اللہ — ہُو —"

مولوی صاحب بولے: "سیاستدان اپنی سیاست چمکانے کے لیے تعلیم عام کرنے کی باتیں کرتے ہیں، کوئی پرائمری سکول کو مڈل بنواتے کا وعدہ کرتا ہے، کوئی مڈل کو ہائی کا درجہ

دلوانے کا چکر چلاتا ہے۔ کوئی ہائی کو اور ہائی کر کے کالج کھولنے کی بات کرتا ہے۔ اگر یہ قُربِ قیامت کی نشانیاں نہیں تو پھر کیا ہے۔ کیوں پیر صاحب قبلہ —؟"

پیر صاحب نے دونوں ہاتھوں کی ایک ایک انگلی آسمان کی طرف کھڑی کر کے ہاتھ کہنیوں سے اُٹھائے۔ بولے: "نجاد زکفر ہے۔ بغاوت جُرم ہے — حق حق ہے — اللہ ہُو —"

مولوی صاحب اب جندوڈے کی طرف متوجہ ہُوئے، بولے: "مسجد کی توسیع اور مرمت کے سلسلے میں حکیم صاحب کا چندہ تو مجھے مِل گیا، اب آپ حسبِ توفیق جو عطا فرمائیں —"

جندوڈے نے دو تین مزید تیزی سے پلکیں جھپکائیں۔ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں معصومیت سے بولا: "ابّا جی نے دے دیئے یا مَیں نے دیئے ایک برابر۔ میں تو ویسے بھی چند روزہ مہمان ہوں۔"

"اللہ ہُو —" پیر صاحب نعرہ لگا کر ڈنڈے کے سہارے اُٹھ کھڑے ہُوئے بولے: "دُنیائے دُنی کی پوری حقیقت کھول کے رکھ دی ہے۔ کیا فقرہ بازی کی ہے۔"

یہ کہہ کر وُہ دسترخوان کو قدموں سے روندتے ہُوئے دروازے کی طرف بڑھے۔

مولوی صاحب بھی ان کے پیچھے لپکے لیکن دسترخوان پر پاؤں رکھنے سے پرہیز کیا البتہ جلدی میں دایاں پاؤں دہی کے ڈونگے میں ڈال دیا۔ ڈونگا پھسل گیا اور آپ بھی اسکیٹنگ کرتے ہُوئے دو گز تک رینگتے چلے گئے۔

"ہا ہا ہا — مولبی — اوئے مولبی —" دروازے کی طرف سے کلکاریاں بھرتے

اور تالیاں بجانے کی آواز آئی ۔

چھوٹا شیطان ملازم مولوی صاحب کی چھڑتی کی داد دے رہا تھا ۔

"کہاں چلے پیر صاحب قبلہ" مولوی صاحب نے بمشکل خود کو گرتے سے بچاتے ہوئے پیر صاحب کا ڈنڈا پکڑ لیا اور کھینچ تان کے لاحول پڑھتے ہوئے ڈونگے سے پاؤں نکالا ۔

"آپ مسجد کی طرف چلیں" پیر صاحب نے ڈنڈا چھڑاتے ہوئے کہا ۔

"مجھے زنان خانے سے بلاوا آیا ہے، مستورات کی طرف جا رہا ہوں ۔ اب ظہر کی نماز کے بعد ملاقات ہوگی ۔"

"بلایا تو مجھے بھی ہے ــــ" مولوی صاحب نے دبی زبان سے کہا "لیکن چلیں خیر آپ ہو آئیں پہلے ــ میں عشاء کی نماز کے بعد آپ کے ڈیرے پر آؤں گا ۔"

دونوں بزرگ رخصت ہونے لگے تو چھوٹا شیطان پیر صاحب کے پاس عقیدت سے جا کھڑا ہوا اور اُن کے ڈنڈے کو بوسہ دیا ۔ پیر صاحب مسکرائے ۔ ڈنڈا اُٹھا کر اس کے سُرخ پھیرا لڑکے نے اس ڈنڈے کا ایک سرا پالکی کے ڈنڈے کی طرح اپنے کندھے پر رکھ لیا یہ سواری کشاں کشاں زنان خانے کی طرف روانہ ہوئی ۔

"یہ کون بیہودہ لڑکا ہے ــــ" میں نے ان کے جانے کے بعد جندوڈے سے پوچھا

"یہ طولعمرہ ہے ــ" جندوڈے نے بتایا "خالو جان قانونی کا بیٹا اور میرا سالا ۔ بڑی منتوں اور مرادوں سے پیدا ہوا ہے ۔ اسی لیے بڑا ہی لاڈلا بچہ ہے ۔ تم نے اسے تنگ تو نہیں کیا ۔ ڈانٹا تو نہیں ۔ حد درجے محتاط رہنا ۔ یہ بچہ نہیں میری قسمت کا لفافہ ہے ۔"

○

حکیم حاذق صاحب کا مطب کیا تھا، ایک عبرت انگیز عجائب گھر تھا ۔ ایک بڑے سے نیم تاریک، پُراسرار اور ڈراؤنے کمرے کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا ۔ جسے ایک قدیم اور اڑے ہوئے رنگ کے بوجھل اور بوسیدہ پردے کی اعانت حاصل تھی ۔ دیواروں پر لُومڑیوں بارہ سنگھوں، اُلّوؤں اور ارنے بھینسوں کی بھُس بھری کھوپڑیاں اس طرح لٹکائی گئی تھیں کہ اندر داخل ہوتے ہی آدمی کا پتہ پانی ہو جائے ۔ دیوار گیر الماریوں کے پٹ ندارد تھے اور ان میں مختلف اقسام کی چھوٹی بڑی شیشیوں اور بوتلوں کی قطاریں نظر آ رہی تھیں ۔ ایک طرف ہاون دستہ رکھا تھا ۔ دوسری طرف لکڑی کے اسٹینڈ پر ایک ادھورا انسانی ڈھانچہ جھول رہا تھا ۔ دیوار کے ساتھ اور حکیم صاحب کی میز کے گرد چند قدیم اور بوسیدہ چرچراتی ہوئی کرسیاں اور بنچ پڑے تھے ۔ جن پر سر دستِ بلّیاں اپنے پنجوں پر تھوتھنیاں رکھے اونگھ رہی تھیں ۔ میز کے پیچھے دو افراد گہری فکر و استغراق میں ڈوبے ہوئے ایک چھوٹی سی شاخ پر بحث کر رہے تھے، جو ان کے درمیان میز پر پڑی تھی ۔ حکیم صاحب کو تو میں نے ان کے اوورکوٹ سے جھٹ پہچان لیا ۔ دوسرے صاحب کا تعارف جندوڈے نے مجھ سے کرایا "چک تن سو باٹھ کے حکیم قادر بخش مفتون ۔ ابّا جی کے بچپن کے دوست اور کاروباری حریف ــ اوّل درجے کی چار سو بیس شخصیت ــ"

حکیم قادر بخش کا قد چھوٹا، آنکھیں عینک پوش، داڑھی ٹھوڑی تک محدود، ہونٹ موٹے، ناک امرود جیسی اور وضع قطع شریفانہ حد تک احمقانہ تھی ۔ انہوں نے سلیٹی رنگ کی ایک شیروانی زیب تن کر رکھی تھی، جس کی دائیں جانب جیب میں رکھے ہوئے

اسٹتھیسکوپ کا دھڑکنیں چیک کرنے والا آلہ نیچے جھول رہا تھا اور ایک بلّی دھیرے دھیرے پنجے مار کر اس سے کھیل رہی تھی۔

ہم دبے قدموں اندر داخل ہوئے اور خاموشی سے بنچ پر بیٹھ گئے۔ جندوڈے نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر مجھے چُپ رہنے کا اشارہ کیا، دونوں حکیم صاحبان دُنیا و مافیہا سے بے خبر سامنے دھری ہُوئی شاخ کی ماہیئت اور اصلیت پر بحث کر رہے تھے۔

"یہ شاخِ زیتون ہے۔" حکیم حاذق نے کہا۔

"یہ عاقرقرحا کلاں ہے۔" حکیم قادر بخش مفتون نے اعلان کیا۔

"یہ تخم بادیاں کی شاخ مقفیٰ ہے۔" حکیم حاذق بولے۔

"یہ بدخشانی بوٹی ہے۔" حکیم قادر منمنائے۔

"یہ لوکاٹ کلاں کی جڑ ہے۔" حکیم حاذق نے فرمایا۔

"یہ اسپنجانِ فارس ہے۔" حکیم قادر چلّائے۔

"یہ مرجانِ منقےٰ ہے۔" حکیم حاذق نے گرج کر کہا۔

"یہ میری مسواک ہے۔" جندوڈے نے لپک کر شاخ اُٹھالی۔

معذرت خواہانہ لہجے میں بولا: "مداخلت کی معافی چاہتا ہُوں ابّا جان! کل میں اپنی یہ مسواک مطب میں بھُول گیا تھا۔ صبح سے ڈھونڈ رہا تھا۔" اس دخل در معقولات پر دونوں حکیم صاحبان اچھل پڑے۔ گھبراہٹ میں دونوں کے سر ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ حکیم حاذق کی ٹوپی گری، حکیم قادر بخش کی عینک۔ دونوں بزرگوں نے اپنی اپنی چیزوں کی تلاش میں ایک بار پھر آپس میں سر ٹکرا دیئے۔ اور سر ہلاتے، گرمی، حس

اور موسم کی بے اعتدالی اور نوجوان نسل کی بے پرواہی اور غیر ذمہ داری پر افسوس کرتے ہُوئے اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔

"حکیم صاحب کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ نئی نسل کدھر جا رہی ہے۔" بالآخر خاصی دیر تک سر ہلانے کے بعد حکیم حاذق صاحب نے کہا۔

"میں خود حیران و پریشان ہُوں، حکیم صاحب۔" قادر بخش نے کہا: "عقل دنگ ہے دماغ گھوم رہا ہے۔ ہمارے زمانے میں نئی نسل ہوتی ہی نہیں تھی۔ سب بُزرگ سمجھدار بُردبار لوگ تھے۔"

"سُنا ہے بھینسوریاں والی میں کوئی سرکاری مطب کھُلنے والا ہے۔" حکیم حاذق نے کہا

"آپ ذرا غور فرمائیں حکیم صاحب، اب ہماری مستورات غیر مردوں سے علاج کروائیں گی، حد ہے۔ حد ہے۔ حد ہے۔ بے حیائی کی حد ہے۔"

"ظلم ہے حکیم صاحب ظلم ہے۔" قادر بخش نے غیض آلود لہجے میں کہا: "ہمارے چک تن سو باٹھ میں نمبردار کی سازش سے ایک سرکاری کلینک کھُلنے والا تھا۔ میں نے معتبرین کو جا کر سمجھایا کہ اوئے عقل کے اندھو، ہوش کرو۔ علاج صرف تمہارا نہیں ہونا تمہاری مستورات کا بھی ہونا ہے۔ کیا تمہاری غیرت یہ گوارا کرے گی کہ شہری ڈاکٹر تمہاری مستورات کو ہاتھ لگائے۔ ان سے پرائیویٹ باتیں پُوچھے۔ اوئے بے غیرتو۔ عقل کرو۔ ہوش کرو۔ جا کے گاؤں کے لوگوں کو سمجھاؤ، قائل کرو۔ صحت اللہ نے دینی ہے کہ سرکاری ڈاکٹر نے۔ پھر سرکاری ڈاکٹر ہی پر اعتقاد رکھنا ہے تو ہم یہاں کس لیے بیٹھے ہیں۔ ہم جو برس ہا برس سے، تمہارے باپ دادوں کے وقتوں سے خدمت کر رہے ہیں تو کس لئے کر رہے

ہیں۔ کیا ہماری بے لوث خدمت کا یہی صلہ ملنا تھا۔ بس جی حکیم صاحب! اللہ نے بچا لیا مُصیبت ٹال دی۔ گاؤں کے لوگوں کو عقل آگئی۔ اب تک آپ کی دُعا سے ہم نے چک تن سو باٹھ میں سرکاری مطب نہیں بننے دیا۔ اب بھمبھیریاں والی پر یہ آفت نازل ہونے والی ہے تو اسے روکنا اور رائے عامہ کو ہموار کرنا آپ کا کام ہے۔" یہ ہدایت جاری کر کے حکیم قادر بخش رُخصت ہونے کے لیے اُٹھے۔ جندوڈے کی پیٹھ تھپکی۔ بولے۔

"شادی مُبارک ہو۔ ذرا شادی سے پہلے کسی دن چک تن سو باٹھ آکر مجھ سے مِل لینا۔ ایک مقوی قلب معجون کا تحفہ پیش کروں گا۔"

جندوڈے نے جلدی سے حکیم حاذق صاحب کی طرف دیکھا وہ شیشوں کی گرد جھاڑنے میں مصروف تھے۔ آہستہ سے بولا "آؤں گا چچا جان، معجون تیار رکھیں"

پھر اونچی آواز میں حکیم حاذق صاحب کو متوجہ کرتے ہوئے بولا "اتنی فرصت کہاں ملتی ہے چچا جان۔ یہ سمجھیں کہ آج زیارت ہو گئی۔ اللہ اللہ خیر سلا۔"

حکیم حاذق نے مُڑ کر دیکھا۔ مجھے حکیم قادر بخش سے علیک سلیک کرتے دیکھ کر چونکے۔ بلند آواز میں کہا "برخوردار بٹالہ۔ علاج ایک ہی معالج سے کرانا چاہیئے، ہر کسی سے مشورہ لیتے مت کھڑے ہو جایا کریں۔ حال مجھے آکر بتائیں۔ میں ہوں آپ کا معالج۔"

حکیم قادر بخش نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور کانوں میں سرگوشی کرتے ہوئے بولے "اِس بڈھے خبیث حکیم کے چکر میں نہ پڑنا۔ تباہ ہو جاؤ گے۔ صحیح علاج کرانا چاہتے ہو تو پُل پار چک تن سو باٹھ میں پہنچو اور کسی سے بھی میرے مطب کا پتہ پُوچھ لو۔ اچھا تو پھر کل کتنے بجے...؟"

میں حکیم حاذق کی مشکوک اور قہر آلود نظروں کی تپش محسوس کر کے ان کے سامنے جا بیٹھا۔ انہوں نے پہلے مجھے گھور کر دیکھا پھر ازرہِ شفقت میرے کندھے پر بند مٹھی سے زوردار تھپکی دی اور پوچھا۔

"برخوردار بٹالہ اپنا مرض بگاڑنے اور اپنا مُردہ خراب کرنے کی کوشش نہ کریں اب آپ کے یرقان کا کیا حال ہے؟ منہ کھولیں۔"

میں نے منہ کھولا۔ انہوں نے ایک چھوٹا مرتبان میرے منہ میں انڈیل دیا۔

ایک انتہائی کڑوا کسیلا کاٹ دار اور چھلانگیں مارنے پر مجبور کر دینے والا سفوف میرے حلق میں پہنچا۔ پھر میں نے حکیم صاحب کے حکم پر منہ بند کر لیا۔ انہوں نے اس عرصہ میں میری نبض پر مسلسل اپنے ناخن گڑوئے رکھے۔ جندوڈا جلدی سے پانی کا گلاس لے آیا۔ مجھے گلاس دے کر ان سے مخاطب ہوا اور دست بستہ عرض کی "ابا جی۔ اب ان کا قصور معاف کر دیں۔ میں حلفیہ بیان دیتا ہوں کہ انہیں یرقان ہرگز نہیں ہے۔"

حکیم صاحب نے ایک دم میری نبض چھوڑ دی۔ بگڑ کر بولے "تو رچشمی جندوڈے میں ایک دو بار پہلے بھی متنبہ کر چکا ہوں کہ میرے طبی معاملات میں دخل نہ دیا کرو تم پہلے بھی میرے دو تین مستقل مریضوں کو بھگا چکے ہو۔ یہ سرگرمیاں تشویش ناک ہیں۔ آئندہ محتاط رہنا۔ ہاں تم اس وقت کیا کہنا چاہتے تھے۔ جب میں حکیم قادر بخش سے سرکاری مطب کھلنے کی خبر پر تبصرہ کر رہا تھا۔"

جندوڈا بھرا بیٹھا تھا۔ ایک دم آگے آکر ایک کُرسی کی پُشت پر دونوں ہاتھ رکھ کر اس طرح جُھک کر کھڑا ہو گیا جیسے فلموں کے جذباتی مناظر میں ہیرو کیا کرتا ہے

بولا: "ابا جی۔ زمانہ بدل گیا ہے۔ یہ سن اکہتی، بتی چونتی نہیں، سن انیس سو نوے ہے اب غیر مستند حکیموں اور عطائیوں کا دور لد گیا۔ نیا زمانہ ہے پرانے ساز بدلے گئے جو بادہ خوار پرانے تھے اٹھتے جاتے ہیں۔ میری یہ بات نوٹ کر لیں، ابا جی کہ جلد یا بدیر آپ کا مطب بند ہو جائے گا اور بھمبھیریاں والی میں ایک نہیں کئی سرکاری ڈسپنسریاں اور شفاخانے کھل جائیں گے۔ کیونکہ عوامی شعور بیدار ہو رہا ہے اور تعلیم عام ہو رہی ہے اگلے سال تک میرے مولا نے چاہا تو گاؤں میں بجلی پہنچ جائے گی اور انشاء اللہ ٹی وی کا بوسٹر بھی لگ جائے گا۔ پھر بیٹھ کر اطمینان سے خیر نامہ اور فہم القرآن دیکھیں آپ کا دل خوش ہو جائے گا ــــ"

حکیم صاحب کی سانسیں اکھڑ گئیں۔ آنکھیں پھیل گئیں، عموماً فلموں کے اس قسم کے مناظر میں مشتعل باپ کو جس طرح نظر آنا چاہیئے وہ بالکل ایسے ہی نظر آ رہے تھے، البتہ ایک کام انہوں نے ایسا کیا جو فلموں میں کم دکھایا جاتا ہے۔ یعنی وہ اطمینان سے اٹھے اور گردن سے پکڑ کر جندوڈے کو ایک ایسی پٹخنی دی کہ وہ دھڑام سے چاروں شانے چت مطب کے فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اسی وقت باہر سے کلکاریاں مارنے اور تالیاں بجانے کی آواز آئی۔ بے شک یہ لاڈلے بچے طولعمرہ کی کلکاریاں تھیں!

وہ لاڈلا بچہ تیزی سے اندر آیا اور نہایت بے تکلفی سے ان کے اوورکوٹ کا دامن کھینچتا ہوا انہیں ایک طرف لے گیا۔ پھر ان کے کان میں کچھ منمنایا۔ حکیم صاحب کا رنگ بدلنے لگا، پہلے زرد، پھر سرخ، پھر کاسنی اور آخر میں نیروی کے انتہائی گرم علاقے کے باشندوں جیسا۔

ان کے منہ سے ایک سرد آہ نکلی اور وہ کراہتے ہوئے جندوڈے کے پاس بیٹھ گئے۔ بولے "برخوردار سعادت اطوار۔ آہ۔ تمہاری شادی کھٹائی میں پڑ گئی"

جندوڈا اچانک ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ بوکھلا کر سر کھجاتے ہوئے بولا "ابا جی! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ اتنی مختصر تقریر کی اتنی بڑی سزا؟ نہیں نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا ابا جی۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"ایسا ہو چکا ہے" حکیم صاحب نے گھمبیر لہجے میں کہا۔ "کل سے تمہارا خالو جان قانونی غائب ہے۔ امکان غالب ہے کہ اسے اغوا کر لیا گیا ہے۔ کیونکہ بھمبھیریاں والی کی تاریخ گواہ ہے کہ یہاں جو مرد پیشگی اطلاع دیئے بغیر غائب ہوتا ہے، اس میں اس کی مرضی کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔"

جندوڈا پرجوش انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔ منہ پر ہاتھ پھیر کر بولا "کوئی مائی کا لال میرے ہونے والے سسر کو اتنے مختصر نوٹس پر اغواء نہیں کر سکتا۔ میں ضروری کمک اور مشورہ لینے چچا مسکین علی سراغی کے پاس جا رہا ہوں۔ آؤ چین کے شہزادے عظیم دانشور میرے دوست، پروفیسر بی کے بٹالہ ــــ اس انتہائی مشکل اور ناگہانی صورتِ حال سے نمٹنے میں میری مدد کرو ــــ آؤ میرے نال ــــ"

ہم بستی کے آخر میں ایک نشیبی راستے سے گذر کر ایک بھربھرے ٹیلے پر چڑھے جس پر چند خستہ حال مکان کھڑے تھے۔ ایک مکان کی چھت پر گوٹے کناری سے سجا ہوا ایک پرچم لہرا رہا تھا، جسے بانس کی مدد سے اونچا اٹھایا گیا تھا، ہم دونوں نالیوں، بکریوں اور شہد کی مکھیوں سے بچتے بچاتے مکان میں داخل ہوئے۔ ایک شخص ہاتھ میں

ہیٹڈل والا محدب شیشہ پکڑے گھٹنوں کے بل زمین پہ بیٹھا غالباً فرشِ خاک کے ذرّات کی انکوائری کر رہا تھا۔ ——— یہی وہ ذاتِ شریف تھی جس کا نام مسکین علی سُراغی تھا۔

"چچا جان ——" جندوڈے نے چنگھاڑ کر کہا۔ "غضب ہوگیا۔ ظلم ہوگیا۔ ہم لُٹ گئے۔ برباد ہوگئے۔ تباہ ہوگئے۔ خالو جان کل سے غائب ہے۔"

مسکین علی سُراغی نے ہم دونوں کو محدب شیشے کی اوٹ سے دیکھا۔ نتھنے پھڑپھڑا کے ہَوا میں کچھ سُونگھا۔ پھر جندوڈے کو فوکس میں لے کر بولے "کتنے بج کر کتنے منٹ پر یہ واردات پیش آئی ہے؟"

جندوڈے نے پریشانی کے عالم میں سر جھکایا۔ نفی میں گردن ہلا دی۔ بولا ——

"کچھ پتہ نہیں۔"

مسکین علی سُراغی نے اب مجھے فوکس میں لیا۔ "جائے وقوعہ کہاں واقع ہے؟"

میں نے عاجزانہ انکار میں سر ہلا دیا۔ "کچھ معلوم نہیں جناب۔"

مسکین علی نے ایک لمبی ہُوں کی۔ "ہُوں اُوں —— واردات کا وقت معلوم نہیں —— جائے وقوعہ کا علم نہیں۔ پھر میرے پاس کس لیے آئے ہو صاحبزادے؟"

یہ کہہ کر پھر مجھے فوکس میں لیا۔ غور سے مجھے دیکھا۔ مشکوک لہجے میں پُوچھا۔

"آپ کا اسمِ شریف؟"

"پروفیسر بی کے بٹالہ ——" جندوڈے نے جلدی سے تعارف کرایا۔ "عظیم دانشور، میرے جگری دوست —— میری شادی میں شرکت کے لیے شہر سے بطورِ مہمانِ خصوصی

تشریف لائے ہیں۔"

"تشریف آوری کب ہُوئی۔" مسکین علی نے بدستور اسی لہجے میں پُوچھا۔

"دو تین دن سمجھ لیں۔" میں نے ندامت کے عالم میں جواب دیا۔

"مگر" مسکین علی نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ "شادی میں ابھی کئی دن باقی ہیں۔ اتنے دن پہلے ایک نامحرم کی آمد کیا معنی رکھتی ہے۔ پٹیالہ صاحب۔ آپ کے اصل مقاصد کیا ہیں اور دو تین دن آپ کی کیا سرگرمیاں رہی ہیں۔ مجھے تفصیل سے بتائیں۔"

"چچا جان" جندوڈا بوکھلا کر بولا۔ "میں آپ کو حلفیہ یقین دلاتا ہُوں کہ ان کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔"

مسکین علی پُرخیال انداز میں مُسکرائے۔ "تعلق ہوتا نہیں صاحبزادے، پیدا کیا جاتا ہے۔ تفتیش کا یہ پہلا اصول ہے۔ دُوسرا اصول یہ ہے کہ مجرم اپنا جُرم چھپانے کے لیے بعض اوقات خود قانون کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ ایسی صورت میں تفتیش میں لحاظ و مروّت سے کام نہیں چل سکتا۔ کیا آپ پر کبھی کوئی مقدمہ قائم ہُوا ہے؟" وہ پھر مجھ سے مخاطب ہوگئے۔

"الحمدللہ" میں نے کہا۔ "ابھی تک کوئی نہیں۔"

مسکین علی اس جواب سے متاثر نہیں ہُوئے بولے "کیا آپ نے کبھی کوائف کیا ہے۔ اگر کیا ہے تو اب تک کتنے افراد کو اغوا کر چکے ہیں؟"

"چچا جان" جندوڈے نے جھنجھلا کر زمین پر پاؤں مارا۔

"بہرحال ——" مسکین علی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "میں ذرا گاؤں میں حالات

معلوم کرلوں۔ پھر آپ سے ملاقات کروں گا تاکہ جو سوال باقی رہ گئے ہیں، ان کو جواب سے محروم نہ رکھا جائے۔"

یہ کہہ کر وہ ہمارے ساتھ چلنے کے لیے روانہ ہوئے۔ جب ہم خاردار جھاڑیوں سے بچتے بچاتے ٹیلے سے نیچے اُتر کر نشیب میں پہنچے تو اُنہیں اچانک ہماری میزبانی کا خیال آگیا۔ سر پر ہاتھ مار کے بولے۔

"باتوں باتوں میں خیال ہی نہیں رہا اور میں تمہارے ساتھ چل پڑا۔ آؤ واپس چلیں پہلے ذرا لسی پانی ہوجائے۔"

جندوڈے نے صاف گوئی سے کہا۔ "اب تو چچا جان اگر آپ نقد پیسے بھی دیں تو میں ٹیلے پر دوبارہ نہیں چڑھ سکتا۔ ہاں پروفیسر بی کے بٹالہ کو لے جا کر لسی پلا لائیں انہیں لسی پینے کا بہت شوق ہے۔ میں یہیں کھڑا آپ دونوں کا انتظار کرتا ہوں۔"

مگر اس کی نوبت نہیں آئی کیونکہ مسکین علی کی نظر جھاڑیوں کے پیچھے ایک خچر سوار پر پڑ گئی تھی جو بستی کی طرف جا رہا تھا۔

اس آدمی نے فیلٹ ہیٹ اور پلاسٹک کی سیاہ عینک سے خود کو مزین اور مرصع کر رکھا تھا۔ وضع قطع کے لحاظ سے وہ اوپری دھڑے کا ڈوبوائے فلموں کا کوئی ادھیڑ عمر اور فلاپ ایکٹر لگتا تھا۔ نیچے اس نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔

جندوڈے نے میرے کان میں کہا۔ "یہ بدرالدین مشکوک ہے۔ پولیس کا سابق مخبر حالیہ دانشور اور سیکرٹ ایجنٹ۔ اُردو میں غالباً ان لوگوں کو کھوجی کہا جاتا ہے۔ پاؤں کے نشانات سے چور پکڑتے ہیں۔"

میں نے آہستہ سے پوچھا۔ "اور اگر چور لنگڑا ہو۔"

"پیرس کے شہزادے۔" جندوڈے نے فخریہ انداز میں نتھنے پھلائے۔ "اگر چور ہیلی کاپٹر سے بھی کسی چھت پر اُترے تو یہ اُس کا کھرا ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ یہ اپنی فیلڈ کے اسپیشلسٹ ہیں۔ اس وقت بھی غالباً یہ کسی سیکرٹ مشن پر جا رہا ہے۔"

مسکین علی نے اسے آواز دے کر بلایا۔

سیکرٹ ایجنٹ نے ڈرامائی انداز میں اپنے خچر کی باگیں موڑیں اور گرد و غبار کے بادل اڑاتا ہوا ہمارے پاس پہنچا۔

آشنائی کی ایک زوردار کوک اس کے حلق سے نکلی اور وہ خچر سے چھلانگ مار کر نیچے اُترا پھر جھاڑی سے اُلجھ کر گرتے گرتے بچا کیونکہ پیڑ کو آدمی سمجھ کر اس نے معانقے کی کوشش کی تھی۔ جب اس نے عینک اُتاری تو اس کے اوسان بحال ہوئے۔ باری باری وہ ہم سب سے بغلگیر ہوا اور بطورِ خاص میرا مزاج پوچھ کر کہا۔

"آپ جناب سے پہلے ملاقات ہو چکی ہے۔"

"کہاں؟" مجھے یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس ہونق صورت ہستی سے کہاں ملاقات ہوئی ہے۔ ایسے لوگ تو کبھی فراموش نہیں ہوا کرتے۔ کیونکہ ان کا حلیہ ان کا شناختی کارڈ ہوتا ہے۔ ملاقات ہوئی ہوتی تو مجھے یاد رہتا۔

"آپ جناب سے حوالات میں ملاقات ہوئی ہے۔" بدرالدین مشکوک نے باچھیں پھیلا کر کہا۔ "آپ جناب وہاں کسی لڑکی کو اغوا کرنے کے سلسلے میں پہنچے ہوئے تھے۔"

"دیکھا؟" مسکین علی نے فخریہ انداز میں جندوڈے کا بازو ہلا کر کہا۔ "میرا شک

درست نکلا۔"

"حاشا و کلاّ میں آج تک کسی لڑکی کے اغواء کی سنسنی خیز واردات سے مشرف یاد نہیں ہُوا۔ میری سات پُشتوں میں کسی نے بہادری کا یہ کارنامہ سرانجام نہیں دیا ہے۔" میں نے بلند آواز سے کہا۔ کیونکہ بصارت کے ساتھ ساتھ مجھے بدرالدین کی سماعت بھی مشکوک معلوم ہو رہی تھی۔

"ہو سکتا ہے۔" بدرالدین نے مایوسی سے کہا۔ "آدمی کو غلط فہمی لگ سکتی ہے۔ ویسے آپ جناب کی تعریف؟"

جندوڈے نے گھُور کر پہلے اسے پھر مسکین علی کو دیکھا۔ باری باری اس نے دونوں کو قہر آلود نگاہوں کے برچھے سے چھیدا۔ پھر مخصوص انداز میں میرا تعارف کروا کے مسکین علی سے پُوچھا۔ "اب آپ جناب کا کیا پروگرام ہے؟"

مسکین علی نے فوراً کہا۔ "میں بدرالدین کے ساتھ تفتیش کے لیے جا رہا ہُوں۔ پھر حکیم صاحب سے ایک خُفیہ میٹنگ کے بعد اگلی کارروائی ڈالی جائے گی۔" بدرالدین نے مجھ سے رُخصتی مصافحہ کرتے ہُوئے ان الفاظ میں اپنی غلط فہمی کی معافی چاہی۔ "آپ جناب پڑھی لکھی ہستی ہیں۔ پھر ہمارے ناچیزوں کے بھتیجے کے دوست ہیں۔ یقیناً مجھے غلط فہمی ہوئی ہو گی۔ میں نے آپ کو حوالات میں اغواء کے سلسلے میں نہیں دیکھا ہو گا۔ کسی قتل کے کیس میں دیکھا ہو گا۔ آپ جناب محسوس نہ کریں۔"

○

رات کو کھانے کے بعد جب ہم سونے کے لیے چھت پر جانے لگے تو جندوڈا

سیڑھیوں میں رُک گیا۔ گلوگیر آواز میں بولا۔ "چین کے شہزادے۔ میرے دوست پروفیسر بی کے بٹالہ۔ میں چچا مسکین کے ناروا سلوک پر تم سے غیر مشروط معافی چاہتا ہُوں۔"

"میں نے انجان بن کر پُوچھا۔ "کس قسم کا ناروا سلوک؟"

بولا "چچا کے آری کے دندانوں سے زیادہ تیکھے ریمارکس۔ آج تک انہوں نے کاؤنٹی بھمبھیریاں والی میں آنے والے کسی شخص کو اجنبی نہیں سمجھا۔ ہر شخص سے تھانہ کچہری جیل، حوالات وغیرہ کا حوالہ دے کر پہلی ملاقات کی ہے اور ہمیشہ اس پہلی ملاقات کو دوسری یا تیسری ملاقات ظاہر کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے۔ اور تم یہ جان کر دنگ رہ جاؤ گے کہ بالآخر وہ اپنے مخاطب کو قائل کر لیتے ہیں۔ مجھے خطرہ ہے کہ اگلی ملاقات پر وُہ تمہیں بھی قائل کر لیں گے۔ اِسی لیے میں نے تم سے پیشگی غیر مشروط معافی مانگ لی ہے۔"

"تمہاری کاؤنٹی بھمبھیریاں والی،" میں نے طنز کیا۔ "اور تمہارے چچا قسم کی مخلوقات مجھے تنگ کر رہی ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں نے سچ مچ کوئی لڑکی اغوا کر لی ہے۔ یا کسی بینک پر ڈال آیا ہوں۔"

جندوڈے نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ بولا "ایسا مت کہو، میرے دوست عظیم دانشور پروفیسر بی کے بٹالہ۔ خُدا کے لیے کاؤنٹی اور میرے عزیزوں کے بارے میں کسی بدگمانی کو اپنے دل میں جگہ نہ دو، یہ گاؤں نہیں جزیرہ ہے اور یہ عزیز نہیں پرندے ہیں۔ براہِ کرم مجھے اس شعر کا مطلب بتاؤ ع

یہ چمن اسی طرح رہے گا اور اس کے جانور وغیرہ
اپنی اپنی بولیاں وغیرہ بولتے ہُوئے اُڑ جائیں گے

یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ جانور وغیرہ کو شاعر نے اس شعر میں اڑن ہار کس طرح ظاہر کیا ہے۔ کیا جانور اڑا کرتے تھے۔؟"

مَیں نے شاعرانہ گرامر کی مجبوریوں کا حوالہ دے کر شعر کی اصلاح کی، اس پر جندوڈا کو اچانک یاد آگیا کہ آج اسے خربوزے لینے کے لیے ٹریکٹر میں ٹرالی فٹ کرکے سرکنڈیاں والی جانا ہے تاکہ ان کے کھیت کے خربوزے صبح کے سورج کی پہلی کرن پھوٹنے سے پہلے منڈی میں پہنچ سکیں۔

مجھے اس پورے پروگرام میں اپنی دلچسپی کا کوئی ذاتی پہلو نظر نہیں آرہا تھا لہٰذا میں نے کسمسا کر جان چھڑانے کے ارادے سے پوچھا۔

"یہ سرکنڈیاں والی کہاں واقع ہے"؟

"ساڑھے سات میل کے بعد" جندوڈے نے بتایا۔ "نہر کے پار جو بستی تمہیں کھیتوں میں چھپی نظر آئے، بلا خوف و خطر اسے سرکنڈیاں والی سمجھو۔ اگر پل ٹھیک ہوتا بھمبھیریاں والی سے اس کا فاصلہ بمشکل ڈیڑھ میل ہوتا۔ لیکن ہم گھوم کر شمال مشرقی کھیتوں کے ساتھ جائیں گے آگے جا کر نہر کا رُخ تبدیل ہو جاتا ہے اور ہم کھلی سڑک پر نکل آئیں گے"

مَیں نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔ "اگر جان کی امان پاؤں تو مَیں سو جاؤں"؟

"بے شک" جندوڈے نے فراخ دلی سے کہا۔ "مزے سے سونا۔ مگر ٹریکٹر کی ٹرالی میں تمہیں یہاں چھوڑ کر مَیں اکیلا نہیں جا سکتا۔ حکم صاحب کا حکم ہے کہ خربوزہ مشن آج رات ہر صورت میں تکمیل تک پہنچنا چاہیے۔ جاؤ بستر سے اپنا تکیہ نکال لاؤ۔ میں ٹریکٹر میں ٹرالی جوڑ کر لاتا ہوں۔"

○

تھوڑی دیر بعد دھڑ دھڑاتا کھڑکھڑاتا ٹریکٹر ٹرالی سمیت دروازے پر آپہنچا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر وحشت زدہ جندوڈا براجمان تھا۔ ایک بدرنگ جینز اور چوڑے کالروں والی تیز لال قمیص کے ساتھ۔ مجھے یاد آیا کہ ایک مرتبہ کسی ڈرامے کے لیے جندوڈے نے یہ لباس کباڑی مارکیٹ کے اُسی یک چشم دکاندار سے مستعار لیا تھا، جس کی واحد آنکھ میں دھول جھونک کر مَیں کوڑیوں کے مول مووی کیمرہ لے آیا تھا۔ جندوڈے نے رات کے اس اندھیرے میں دھوپ کی عینک لگا رکھی تھی۔ جب مَیں پچھلے پہیے کے مڈگارڈ پر اس کی سیٹ مضبوطی سے تھام کر بیٹھ گیا تو ٹریکٹر آگے بڑھانے سے پہلے اس نے مجھے بتایا۔ "چین کے شہزادے۔ یہ عینک مجھے فضا میں اُڑتے ہوئے کیڑے مکوڑوں اور پتنگوں سے محفوظ رکھے گی۔ ڈرائیور حضرات کو اسی قسم کی عینک سوٹ کرتی ہے"۔

مَیں نے اس کے نظریۂ ضرورت سے اتفاق کیا۔ مگر کاؤ بوائے لباس کی وجہ تسمیہ جاننے کے لیے محض اس کی قمیص کا چوڑا کالر کھینچنے پر اکتفا کیا۔

"خربوزہ مشن۔" وہ جوش و خروش سے میری طرف جھک کر بولا۔ "محض خربوزہ مشن نہیں ہے۔ اس کی تہہ میں اس پیغام کی تکمیل بھی شامل ہے، جو آج صبح مجھے ملکۂ جذبات مختاراں کی طرف سے موصول ہوا ہے۔ ہم اب سے تھوڑی دیر بعد جذبات کی اس ملکہ سے پل کے پاس والے کھیتوں میں مل رہے ہیں"۔

مَیں چونک پڑا۔ مختاراں کا نام سُن کر میرے جسم میں سنسنی کی ایک لہر دوڑی۔ میری تمام دلچسپیاں یکایک جاگ اُٹھیں۔ مَیں نے جندوڈے کا بازو دبا کر تصدیق چاہی۔

"ہم سے تمہاری کیا مُراد ہے۔ جندوڈے میری جان — کیا دوسری نابغۂ روزگار ہستی

یعنی سرداراں بھی میدانِ عمل میں موجود ہوگی۔؟"

جندوڈے نے اس موقع پر اپنی روائتی سرد مہری سے کام لیا۔ سوکھا سا منہ بنا کر بولا۔ "اس کے بارے میں پیغام میں کوئی وضاحت نہیں کی گئی۔ صرف مجھے اتنا بتایا گیا کہ آج رات نو بجے پل کے قریب کھیتوں میں شیشم کے درخت کے نیچے مختاراں میری منتظر ہوگی۔ لہٰذا میں آنا کانی سے پرہیز کروں اور وقتِ مقررہ پر سونے کی اس انگوٹھی کے ساتھ جائے وقوعہ تک پہنچوں، جسے دینے کا وعدہ میں گزشتہ ایک سال سے زائد مدت سے کرتا چلا آرہا ہوں۔"

"انگوٹھی کا کیا قصہ ہے؟" میں نے فوراً پوچھا۔ کیونکہ جندوڈا کا شمار ان عشاق میں ہوتا ہے جو صرف جان دینے کا وعدہ کرتے ہیں۔ چیز دینے کا وعدہ نہیں کرتے خواہ اس کی مالیت تین روپے پچاس پیسے ہی کیوں نہ ہو۔ بعض اوقات تو اس نے اس سے بھی کم مالیت کے تحائف کے بل بوتے پر عشق کیا ہے اور حسبِ توفیق ناکام یا کامیاب رہا ہے۔

"مختاراں!" جندوڈے نے بڑی ادا سے لہک کر کہا۔ "جذبات کی ملکہ حسن کی دیوی۔ سوا سال سے میرے عشق کی آگ میں سُلگ رہی ہے۔ لیکن حکیم صاحب کے خوف کی وجہ سے یہ عشق پروان نہیں چڑھ پایا۔ ہم نے کئی مرتبہ ایک دوسرے کو ملاقات کے خفیہ پیغامات بھیجے، لیکن عین وقت پر کوئی نہ کوئی رکاوٹ کھڑی ہوگئی یا وقت کی ایڈجسٹمنٹ میں گڑبڑ ہوگئی۔ اس لحاظ سے آج ہم دونوں کی پہلی ملاقات ہے۔ براہِ کرم میری قمیص کے اوپری جیب کا ڈھکن اٹھا کر مخملیں ڈبیہ میں رکھی ہوئی انگوٹھی نکالو اور تخمینہ لگا کر بتاؤ کہ بازار کے بھاؤ کے مطابق اس کی کیا قیمت ہوگی؟"

میں نے اس کی جیب ٹٹول کر ڈبیہ نکالی۔ اسے کھول کر انگوٹھی نکالی، غور سے اسے آنکھوں کے قریب لے جا کر دیکھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے مایوسانہ انداز میں سر ہلا دیا۔

"اس وقت ۔" جندوڈا تیزی سے ایک موڑ کاٹتے ہوئے بولا۔ "اس کی قیمت نگینوں سمیت سات ہزار نین سو روپے تک ہے۔ مگر یہ قیمت مختاراں کے لیے ہے۔ تم سے گہری دوستی کے ناطے خاص رعایت کی جا سکتی ہے۔ بولو۔ چھ روپے دیتے ہو اس انگوٹھی کے۔؟"

میں نے حیرت سے چیخ پڑنے والے انداز میں کہا۔ "چھ۔ چھ روپے؟ جندوڈے۔ میری جان۔ ہوش کے ناخن لو۔ سونے کے بھاؤ کو اتنا مت گراؤ۔ مانا کہ تم میرے دوست ہو۔ لیکن سونے کی عالمی منڈی میں اہمیت اور قیمت کا بیڑہ غرق نہ کرو۔"

"چین کے شہزادے۔" جندوڈے نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ "میں پوری طرح تم سے متفق ہوں کہ سونے کا بھاؤ گرانا نہیں چاہیئے۔ بشرطیکہ وہ سونا ہو۔ پیتل کے سلسلے میں اس طرح کی کوئی پابندی ہم پر عائد نہیں ہوتی۔"

"پیتل؟" میں نے کہنا چاہا، مگر جندوڈے نے جھٹ سر ہلا کر میری بات کاٹ دی۔ بولا۔ "ہاں! پیتل — بیچ مچ پیتل — پانچ روپے میں یہ انگوٹھی میں نے بڑی تحقیق اور تلاش کے بعد مینا بازار سے خریدی تھی۔ محض ایک روپیہ منافع کاٹ رہا ہوں۔ کیا چھ روپے میں تمہارے نزدیک یہ انگوٹھی مہنگی ہے۔؟"

میں نے کہا۔ "اور اگر مختاراں کو یہ پتہ چل گیا کہ سونے کے نام پر تم نے اسے پیتل تھما دیا ہے تو ——"

جندوڈے نے پھر میری بات کاٹ دی۔ "ایسے ہرجائی پرندے جو ہر چوکھٹ پر دانہ چگنے کے عادی ہوں، ان کا علاج ہی یہی ہے کہ ان کے معاملے کو دل کا روگ نہ بنایا جائے۔ وُہ اگر تمہیں غچہ دے رہے ہیں تو تم بھی انہیں غچہ دے دو۔ بھبھیریاں پوا دو — ان کے ہوش ٹھکانے لگا دو۔"

ایک لمحے کے لیے اس نے توقف کیا، پھر بولا — "علامہ صاحب اس موقع پر کیا فرماتے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "افسوس! علامہ صاحب کو کبھی ایسی بیہودہ باتوں سے واسطہ نہیں پڑا۔ ورنہ ان کے کلام بلاغت نظام میں ہمیں اس موقع پر استعمال کے قابل اشعار بھی مِل جاتے۔"

"بہرحال" جندوڈا ایک گہرا سانس لے کر بولا۔ "دانشور حضرات ہر موقع کے لیے کچھ نہ کچھ مصالحہ تیار کر کے رکھتے ہیں تاکہ تقریر میں، گفتگو میں یا حوالے وغیرہ دینے کے سلسلے میں کام آئے۔ میرا ارادہ ہے کہ میں اپنے اور تمہارے اقوالِ زرّیں کتابی صورت میں شائع کروں لیکن یہ بعد کا پراجیکٹ ہے۔ سرِدست مجھے ایسے اشعار اور فقرے یاد کراؤ جو میں وہاں بول کر میدانِ عشق کی انشاء پردازی میں کامیاب ہو سکوں۔"

میں اشعار اور ایسے فقرے سوچنے لگا جو معشوق کا دل تڑپا کے رکھ دیں۔ اس کے خرمنِ ہوش پر برقِ بے اماں بن کر ٹوٹ پڑیں۔ اسے تہس نہس کر کے رکھ دیں۔

○

یکایک چاند نکل آیا۔ اس وقت ہم گھنے درختوں کے ساتھ ساتھ گھومتے بل کھاتے راستے پر رواں دواں تھے اور درختوں کے جھنڈ اچانک پیچھے رہ گئے تھے اور کھلی فضا

میں چاند ہمارے عین سامنے تھا۔

"پہاڑی بکرا!" جندوڈے نے بے تحاشہ چلّا کر ٹریکٹر کی رفتار تیز کرتے ہوئے کہا۔ "چین کے شہزادے — مبارک — صد ہزار بار مبارک۔ کل دوپہر کے کھانے کا بندوبست ہو گیا۔ ایک اعلیٰ درجے کی دعوت۔ براہِ کرم چھلانگ مارو۔ اور بکرے کا تعاقب کرو۔ میں اس کی آنکھوں پہ روشنی ڈالتا ہوں، تاکہ وہ چکا چوند ہو کر کھڑا رہے بھاگ نہ سکے۔"

میں نے کہا۔ خیر مبارک۔ بے شک وہ ایک بکرا ہے لیکن میرا دعویٰ ہے کہ وہ اس وقت پہاڑی نہیں میدانی ہے کیونکہ اس کے گلے میں بندھی ہوئی رسّی کا دوسرا سرا ایک لمبی مونچھوں والے شخص کے ہاتھ میں ہے۔ خُدا کے لیے اب تو اپنی عینک اُتار دو۔"

خلافِ توقع جندوڈے نے فوراً عینک اُتار کر ٹریکٹر کی رفتار ہلکی کر دی۔ رفتار پر قابو پا لینے کے باوجود جندوڈا ٹریکٹر پر قابو نہ پا سکا اور اس کی ٹھوتھنی بکرے اور بکرے والے کو رگیدنے سے باز نہ رہ سکی۔ ہم چاروں بیک وقت بلبلا اُٹھے۔ جندوڈے نے بریک لگا کر فوراً متاثرین کی طرف چھلانگ لگائی اور "اوئے چاچا نصیر الدّین" کہتا ہُوا دھپ سے چاروں شانے چت زمین پر جا پڑا۔ چاچا نصیر اور اس کے بکرے نے جندوڈے کو اُٹھایا۔ میں نے بھی ٹرالی سے اُتر کر اس کارِ خیر میں اپنا حصّہ ڈالا۔ جندوڈا کپڑے جھاڑتا اور ناہموار زمین کو بُرا بھلا کہتا ہُوا آہستہ آہستہ اُٹھا۔

"چچا نصیر الدّین عُرف کالی بدریا۔" اس نے کراہتے ہُوئے نووارد کا تعارف مجھ سے

کروایا۔" سابق پٹواری، گرداور حالیہ دانشور اور مشیرِ زراعت۔"

میں نے مشیرِ زراعت سے ہاتھ ملایا۔ جندوڈے نے فوراً وضاحت کردی "یہ صرف بھمبھیریاں والی کے باشندوں کے مشیر ہیں اور یہ عہدہ ہم نے انہیں اعزازی طور پر دیا ہے۔ دو مرتبہ یہ کونسلرشپ کا الیکشن ہار چکے ہیں، اس مرتبہ ہم انہیں صوبائی اسمبلی کے لیے کھڑا کریں گے۔"

چچا نصیرالدین کا بکرا ہم تینوں کے درمیان کھڑا باری باری ہر شخص کا منہ دیکھ رہا تھا اور وقفے وقفے سے جندوڈے کی ڈھکی ہوئی آستین چبا رہا تھا۔ اس کا بھی تعارف کرایا گیا۔

"ایک بُردبار دانشور بکرا۔ چچا کا ساتھی اور واحد صلاح کار۔ چاچی کی وفات کے بعد چچا کا زیادہ تر وقت اسی کی معیت میں گذرتا ہے۔"

یہ چچا نصیر دبی زبان سے شکایت کرنے لگا کہ اب تک جندوڈے نے اس کے رشتے کے سلسلے میں کوئی کارروائی نہیں کی اور وہ تنہائی کی زندگی اور بکرے کی رفاقت سے تقریباً تنگ آچکا ہے۔

"انشاءاللہ"، جندوڈے نے اسے تسلی دی۔ "بہت جلد آپ کا کام ہوجائے گا۔ اُمید تو یہی ہے کہ آج رات ہی میں مندری والی کی بیٹی کو رضامند کرلوں۔"

"مُندری والی کی بیٹی کو۔؟"

میں نے حیرت سے جندوڈے کے چٹکی لی۔

"ہاں! مندری والی کی بیٹی کو۔" جندوڈا قطعیت سے بولا۔ "تاکہ وہ اپنی

والدہ ماد موزیل مندری والی کو چچا نصیرالدین سے نکاح پڑھوانے پر رضامند کرے۔"

"تمہارے مُنہ میں گھی شکر۔" چچا نصیر باچھیں پھیلا کر بولا۔ "اندازاً یہ کام آج رات کتنے بجے تک ہوجائے گا؟"

"تقریباً ایک گھنٹے بعد۔" جندوڈے نے پوری سنجیدگی سے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔" چچا نصیر نے پُراشتیاق لہجے میں کہا۔ "میں یہیں انتظار کرتا ہوں۔ تُم کہاں جارہے ہو۔؟"

"سرکنڈیاں والی۔" جندوڈے نے ہاتھ اُٹھا کر دُور اشارہ کیا۔

چچا نصیر نے فوراً اپنی صدری کی جیب سے چند مڑے تڑے نوٹ نکالے، انہیں جندوڈے کی مٹھی میں ڈالتے ہوئے بولا۔ "چاندی کے ورق والی برفی لیتے آنا، پیسے کم پڑیں تو اور لے جاؤ۔"

"مناسب تو نہیں ہے۔" جندوڈے نے ندامت آمیز لہجے میں کہا۔ "بہرحال آپ اصرار کرتے ہیں تو تبرک کے طور پر رکھ لوں گا۔" یہ کہہ کر اس نے ہتھیلی پھیلا دی۔ چچا نصیر نے اب کے دھوتی کی ڈب سے کچھ اور نوٹ نکالے اور گنے بغیر اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

جندوڈے نے یہ تمام نوٹ حیرت انگیز طور پر میری جیب میں ڈال دیئے بولا "میرے دوست، عظیم دانشور، پروفیسر جی۔ کے بٹالہ۔ اپنے بابرکت ہاتھوں سے اس تمام رقم کی مٹھائی خریدنا۔ تاکہ نذر نیاز دلوائی جائے۔" پھر چچا نصیر سے رُخصتی مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ "آپ اطمینان سے گھر جاکر خیالِ محبوب دل میں بسا کر سوجائیں۔

رپورٹ آپ کو صبح ملے گی اور انشاء اللہ اوکے ہوگی۔ مجھے سرکنڈیاں والی سے خربوزے لاکر منڈی میں نہ پہنچانے ہوتے تو آج ہی رات آپ کا نکاح پکا تھا۔ بہرحال صبح تک انتظار کریں کہ پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے ٹریکٹر اسٹارٹ کر دیا۔

جب ہم چچا نصیر اور اس کے بکرے کی نگاہوں کی زد سے دور نکل آئے تو جندوڈے نے ٹریکٹر روک دیا۔

ہم نہر کے ساتھ ساتھ پھیلے ہوئے کھیتوں کے پاس تھے۔ سامنے کچھ درخت تھے۔ بعض کھیتوں کے درمیان تھے۔ بعض ان کے عقب میں اور بعض سامنے مطلوبہ درخت کی طرف بڑھنے سے پہلے جندوڈے نے ہدایات جاری کیں۔ "تم ٹرالی میں آرام کرو گے۔ کسی خطرے کی صورت میں سیٹی بجاؤں گا۔ تم فوراً میری مدد کے لیے پہنچو گے۔ اگر اتفاقاً کوئی شخص ادھر آ نکلے اور تم سے کچھ تحقیق و تفتیش کرے تو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اسے بتا دینا کہ ٹریکٹر حکیم صاحب کا ہے اور وہ بعض فوری ضروریات کی تکمیل کے لیے سامنے کھیتوں میں تشریف لے گئے ہیں۔ خبردار کسی شخص سے زیادہ دیر باتیں کرنے یا اخلاقاً اسے ٹرالی میں بیٹھ کر حکیم صاحب کا انتظار کرنے کی دعوت نہ دینا۔ براہِ کرم چچا نصیر کی رقم فوری طور پر گن کر میرے حوالے کرو۔"

میں نے طوعاً و کرہاً جیب میں ہاتھ ڈالا۔ نوٹ گنے۔

جندوڈے نے سینتالیس روپے دوبارہ گنے اور انہیں اپنی جیب میں ڈال کر اس امر پر افسوس کیا کہ دنیا بڑی کایاں اور شوم ہو گئی ہے۔ رشتے ناطے جیسے دلچسپ معاملے میں بھی خست سے کام لیتی ہے۔ سینتالیس روپے کیا چیز ہیں ان سے تو سینتالیس منٹ تک جیب بھی گرم نہیں رکھی جا سکتی۔ پھر وہ بڑبڑاتا اور گنگناتا ہوا کھیتوں کی طرف بڑھا۔ کچھ آگے جا کر وہ تیزی سے واپس پلٹا۔ اس کی سانسیں

ناہموار ہو رہی تھیں۔ ہانپتے ہوئے بولا۔ "چین کے شہزادے۔ میں تم سے یہ پوچھنا بھول گیا تھا کہ اس نازک وقت پر مجھے سب سے پہلے علامہ صاحب کا کونسا شعر پڑھنا چاہیے دوسری بات ——" وہ پل بھر کے لیے جھجکا۔ "کیا تم مجھے رخصت کرنے کے لیے کھیتوں کی مینڈھ تک چل سکتے ہو۔"

میں نے حیرت سے کہا —— "مگر تمہارے پروگرام میں یہ شق پہلے تو شامل نہیں تھی۔"

"اب ہو گئی ہے ——" وہ گہری گہری سانسیں لے کر بولا —— "براہِ کرم کوئی ڈنڈا تلاش کرو یا کسی درخت کی موٹی سی شاخ توڑ کے حفاظتِ خود اختیاری کا بندوبست کرو۔ کیونکہ کھیتوں کے پاس تین چار خوفناک کتے ٹہل رہے ہیں۔ مجھے شبہ ہے کہ یہ بھیڑیاں والی کی زبان نہیں سمجھتے ——"

ہم دونوں نے ٹرالی پر چڑھ کر قریبی درخت سے پتوں سے بھری ہوئی دو شاخیں توڑیں۔ انہیں لہرایا تو پتے آپس میں ٹکرا کر بج اٹھے۔ ایسی آواز آئی۔ جیسے مداری کا تماشہ دیکھنے والے بچے قلقاریاں مار رہے ہوں۔

دونوں شاخیں میں نے جندوڈے کو پکڑا دیں۔

"ہمت کرو ——" میں نے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا —— "میدانِ عشق میں کود پڑو۔ اور مارا مارا کرتے ہوئے وصالِ محبوب سے مستفید و شاد کام ہو جاؤ۔ شاباش ——"

جندوڈا کچھ دیر تک کھڑا ہچکچاتا رہا۔ پھر میرے بار بار غیرت دلانے پر اسے تاؤ آ گیا۔

"اچھا خدا حافظ چین کے شہزادے ——" وہ اونچی آواز میں بولا —— "میں تمہاری ہر جائی دوستی کا داغ اپنے دل پر لے کر میدانِ کارزار کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ میرے لیے دعا کرنا۔ بڑے بدتمیز کتوں سے واسطہ پڑنے والا ہے۔" یہ کہہ کر وہ دونوں ہاتھوں میں پکڑی ہوئی شاخیں شائیں شائیں لہراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

میں نے تکیہ اٹھا کر اپنے سرہانے رکھا اور رابنسن کروسو کی طرح ٹانگوں پر ٹانگیں رکھ کر ٹرالی میں لیٹ کر چاند کو دیکھنے لگا۔ جو شاخوں کے پیچھے سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔ دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آئیں۔ بلاشبہ جنڈو ڈا کتوں کے نرغے میں پہنچ چکا تھا بلکہ چنگل میں پھنس چکا تھا۔

پہلے چند کتوں کی آوازیں صرف کھیتوں کے قریب سے آرہی تھیں پھر فرداً فرداً ہر طرف سے آنے لگیں۔ کچھ کتے غرا رہے تھے۔ کچھ بھونک رہے تھے۔ اور کچھ دوڑتے ہوئے اپنے شکار کی طرف جا رہے تھے۔ گھمسان کا رن پڑنے والا تھا۔

مجھے وہ شام یاد آئی جب میں پہلی بار بھمبھیریاں والی کے کتوں سے متعارف ہوا تھا۔ ان کی پُرجوش پذیرائی کی یاد اب تک میرے دل سے نہیں نکلی تھی۔ کچھ کتے غراتے ہوئے ٹرالی کے قریب سے گزرے۔ میں نے سہم کر اپنی پیٹھ ٹرالی کی اندرونی دیوار سے لگالی۔ چاند، جنگل، کھیت، نہر اور کھلی فضا کی خنک ہوا کا رومان۔ ہر چیز خوف کی گہری دھند کی اوٹ میں چھپ گئی۔

کتے خاصی دیر تک بھونکتے رہے۔ پھر ان کی آوازیں کورس کی صورت میں مجتمع ہو کر ایک سمت بڑھنے لگیں۔ اب مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ٹرالی سے سر اٹھایا۔ دور کھیتوں کی طرف دیکھا۔ دھندلی چاندنی میں کچھ نظر نہ آیا۔ البتہ کتوں کے غول کا غول ایک طرف بھاگا جا رہا تھا۔ اس سمت ایک گنداجوہڑ اور پرانا کھنڈر تھا۔

○

بلاشبہ کتے جنڈو ڈے کے تعاقب میں تھے اور وہ جان بچانے کے لیے اور کوئی راہ فرار نہ پا کر کھنڈر کی طرف بھاگ نکلا تھا۔

میں نے اللہ کا نام لے کر ٹرالی سے ٹریکٹر پر چھلانگ لگائی اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر ٹریکٹر اسٹارٹ کر دیا۔ مشینری کی بھیانک کھڑاڑ کھڑڑ اچھے بھلے انسان کا پتہ

پانی کرنے کیلئے کافی تھی۔ کتے بہر حیسارت نہیں کر سکتے تھے۔ کہ وہ چلتے ہوئے ٹریکٹر کے سامنے آئیں۔ چنانچہ میں نے رفتار بڑھا کر اس کا رُخ گرد و غبار کے اس لمبے نشان کی طرف موڑ دیا جو کتوں کے بھاگنے کی وجہ سے زمین سے اُٹھ کر دھیرے دھیرے فضا میں بلند ہو رہا تھا۔

جلد ہی میں لشکر کے پاس پہنچ گیا۔ ٹریکٹر اور ٹرالی کی دھڑ دھڑ کھڑ کھڑ نے پہلے تو ان کی رفتار کم کی پھر ان کی بھاگتی ہوئی قطار تتر بتر ہونے لگی۔ قسمت کا مارا ایک کتا بھاگتا ہوا ٹریکٹر کے اگلے پہیوں سے ٹکرایا۔ قسمت نے یاوری کی اور ٹریکٹر کے نیچے سے دم دبا کر بخیر و عافیت دوسری طرف نکل گیا۔ مگر نکلتے ہی اس نے واویلا مچا دیا۔ غالباً وہ خطرے کا سگنل دے رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے ہی اطراف و جوانب میں بکھرے ہوئے کتے دم دبائے، منہ اٹھائے منتشر ہونے لگے۔

آن کی آن میں میدان صاف ہو گیا۔ میں نے ٹریکٹر روک دیا۔ لیکن مشین اسٹارٹ رہنے دی۔ دائیں بائیں دیکھ کر پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا میں نیچے اترا۔

اب کتوں کے اڑائے ہوئے گرد و غبار کا رخ بھمبھیریاں والی کی طرف تھا۔ فضا میں امن کے پھریرے لہرا رہے تھے۔ اور چاند نسبتاً زیادہ روشن ہو گیا تھا۔

"جنڈو ڈے۔ میری جان۔" میں نے منہ کے آگے دونوں ہتھیلیاں رکھ کر آواز دی۔ "جہاں ہو۔ نکل آؤ۔ امدادی کمک پہنچ چکی ہے۔" کوئی جواب نہیں آیا۔ البتہ جوہڑ کی طرف سے کچھ مینڈک ضرور ٹرائے۔ میں آہستہ آہستہ قدم قدم سرکتا ہوا آگے بڑھا۔ ساتھ ساتھ جنڈو ڈے کو آوازیں دیتا گیا۔ اگر وہاں کوئی منتقم مزاج کتا مجھے دیکھ لیتا تو اگلی کارروائی کے لیے اسے کسی تمہید کی ضرورت نہ پڑتی۔ لیکن ماحول ساز گار تھا۔ حالات موافق تھے۔ ستاروں کی چال ہمارے حق میں تھی۔ کسی کتے نے لپک کر مجھ پر حملہ نہیں کیا۔ میں بے خوفی سے سیٹیاں

بجا تا ہوا جب جوہڑ کے کنارے دلدلی زمین کے قریب پہنچا تو یکا یک میری خوش فہمی ایک دم رفع ہوگئی۔ پوری قوت سے ایک پنجہ میری پنڈلی پر پڑا۔ میں دھڑام سے اوندھے منہ زمین پر گرا۔ ایک دل دوز چیخ میرے حلق سے نکلی۔ لیکن دوسری چیخ میری نہیں۔

جندوڈے کی تھی۔ وہ میری پنڈلی مضبوطی سے پکڑے ہوئے دلدل سے باہر نکل رہا تھا۔

سر سے پاؤں تک کیچڑ میں لتھڑا ہوا جندوڈا۔ بلاشبہ وہ کسی انتہائی ڈراؤنی فلم کے اعلیٰ ترین قدرتی گٹ اپ میں تھا۔

"اگر تم نہ پہنچتے ——" وہ ہانپتے اور کیچڑ صاف کرتے ہوئے بولا —— "تو آج بھیمبھیریاں والی اپنی ایک اہم شخصیت سے محروم ہو جاتی۔ میرے دوست، عظیم دانشور پروفیسر بی کے بٹالہ۔ مجھے تمہاری دوستی پر ناز ہے ——"

"مختاراں کہاں ہے؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"جذبات کی ملکہ ——" جندوڈا گہرے تاسف انگیز لہجے میں بولا "حسبِ سابق آج بھی نہیں آئی۔ چکمہ دے گئی۔ ممکن ہے وقت کی ایڈجسٹمنٹ میں مجھ سے غلطی ہوئی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی ناگہانی مجبوری کی وجہ سے وہ گھر سے نکلنے ہی نہ پائی ہو۔"

وہ ایک لمبا سانس لے کر بولا —— "وہ اتنی مجبور اور پابند کبھی نہیں رہی۔ وفا کی جو دیوی اپنی بہن کے ساتھ ہر تیسرے چوتھے دن مندری پر انڈے لینے کے لیے شہر جا سکتی ہو وہ یقیناً کھیتوں تک بھی آ سکتی ہے —— خیر ——"

اس نے میرے کندھے پر ایک بازو کا دباؤ ڈال کر سہارا لیا۔ "براہ کرم مجھے نہر تک لے چلو تاکہ میں کپڑوں سمیت غسل کر سکوں۔"

میں اسے نہر کے اس کنارے تک لے گیا۔ جہاں ٹریکٹر کھڑا تھا۔ چلتے ہوئے وہ اتنی مرتبہ لڑکھڑایا اور ڈگمگایا کہ میرے کپڑے بھی کیچڑ میں لت پت ہو گئے۔ چنانچہ مجھے بھی اس کے ساتھ نہر میں اترنا پڑا۔

دیر تک ہم نہر میں نہاتے رہے۔

جب ہم پانی میں شرابور کپڑوں سمیت نہر سے باہر نکلے تو ٹریکٹر ٹرالی کے عقب سے گزرتی ہوئی دو عورتوں کے قہقہے سنائی دیے۔

"خبردار ——" جندوڈے نے جھٹ میرا بازو پکڑ کر مجھے دوبارہ نہر میں گھسیٹ لیا —— "خود کو منظرِ عام پر لانے کی ضرورت نہیں۔ بلاشبہ یہ اِن ہوش ربا مندری والیوں کی آوازیں ہیں۔ وہ میری تلاش میں ناکام ہو کر گاؤں واپس جا رہی ہیں ——"

میں نے بے صبری سے کنارے کی طرف لپکنا چاہا —— "انہیں آواز دو۔ بتاؤ کہ تم یہاں ہو۔ خدا کے لیے جلدی کرو ——"

"شش ——" اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے مزید نیچے گھسیٹ کر سرگوشی کی:

"عشق و عاشقی خشک اور استری شدہ کلف لگے خوشبودار کپڑوں میں اچھی لگتی ہے۔ کیچڑ میں ڈوبا ہوا عاشق عاشقوں کے منہ پر ایک طمانچہ ہے۔ عشق کے نام پر ایک دھبہ ہے۔"

میں نے جاتی ہوئی آوازوں کی طرف کان لگائے۔ ایسا محسوس ہوا جیسے ایک نے دوسری کو مخاطب کر کے کہا ہو۔ "میرا یقین ہے کہ وہ انگوٹھی نہیں لایا ہوگا۔ کنجوس آدمی ہے۔ اچھا ہوا کتے اس کے پیچھے پڑ گئے۔ ایسے کچے عاشقوں کا یہی انجام ہونا چاہیئے ——"

آخری چند الفاظ جندوڈے نے بھی سن لیے۔ بے ساختہ طیش میں آ گیا۔ نتھنے پھُلا کر اور مٹھیاں بھینچ کر پہلے تو اس نے پانی پر مُکّے مارے۔ پھر جوشیلے انداز میں کنارے کی طرف لپکا۔ بولا —— "ٹھہرو اوئے باگڑ بلّیو" میں نے پتلون کی بیلٹ پکڑ کر اسے کھینچ لیا —— "کوئی فائدہ نہیں جندوڈے میری جان۔ اس روپ میں ان کے سامنے جا کر ہمیشہ کے لیے انہیں خود سے دور مت کرو۔ صبر کرو۔ کسی نہ کسی موقع پر مناسب انداز میں اپنے دل کا غبار نکال لینا۔ شانتی ——"

"ملایا کی یہ بتیاں ــــ" وہ آپے سے باہر ہو کر منہ سے جھاگ چھوڑتے ہوئے بولا ــ "سماٹرا کی یہ مینڈکیاں ۔ بھمبھیریاں والی کی یہ آفت کی پرکالائیں یہ شیطان کی خالائیں ۔ میں ابھی سنگ باری کر کے انہیں سنگسار کرتا ہوں ــــ"

مگر اتنے میں وہ دونوں سنگ باری کی حدود سے دور نکل چکی تھیں ۔ ہم ٹریکٹر کے پاس کھڑے ہو کر کپڑے سکھانے لگے ۔

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی چین کے شہزادے ــــ" جندوڈے نے خاصی دیر بعد قدرے نارمل لہجے میں کہا ــــ "وعدہ مختاراں نے کیا تھا پیغام میں کہیں سردار اں کا ذکر نہیں تھا ۔ پھر اسے لے کر کیوں آئی ــ کیا دو بہنیں بیک وقت ایک شخص پہ عاشق ہو سکتی ہیں ــــ"

"ہر شخص پہ نہیں ــــ" میں نے فوراً تصحیح کی ــــ "صرف جندوڈے پہ"

اس پر اس نے خوش ہو کر اعلان کر دیا ــــ "خربوزہ مشن ملتوی ــــ"

میں نے پوچھا ــــ "حکیم صاحب کو کیا جواب دو گے ؟"

"سالقہ جواب ــــ" جندوڈے نے مضبوط لہجے میں کہا ــــ "وہ میرے اس قسم کے جوابوں کے عادی ہیں ۔ انہیں معلوم ہے کہ ملک جے ڈبلیو ان کا بیٹا ہے ۔ یگانۂ روزگار ۔ یکتائے زمانہ ۔ براہِ کرم مجھے یہ بتاؤ یگانہ اور یکتائے صاحبان کون تھے ۔ ان کا سنہ پیدائش اور تاریخ وفات کیا تھی ۔ کیا خیر کبھی کوئی پوچھ ہی بیٹھے ــــ"

میں نے اعتراف کیا کہ یگانہ کی حد تک اردو شاعری چاٹنے اور سونگھنے کا شرف تو مجھے حاصل ہوا ہے مگر یکتائے صاحب تک ابھی میں نہیں پہنچا ۔

اس پر جندوڈے نے میری حالت پر افسوس کیا اور تاسف انگیز انداز میں منہ سے چچ چچ کی اشتعال دلانے والی آوازیں نکالتا اور سر کو دائیں بائیں ہلاتا ہوا ٹریکٹر اسٹارٹ کرنے لگا ۔

ہم لمبا چکر کاٹ کر "چناں کتھے گذاری آئی رات وے" گاتے ہوئے

بھمبھیریاں والی کی گلیوں میں داخل ہوئے تو رات خاصی گذر چکی تھی اور دائیں بائیں کونے کھدرے میں اونگھنے والے کتے محض ہلکی سی عف ۔ خرر پر اکتفا کرتے دکھائی دیئے ۔

چچا نصیر الدین عرف کالی بدریا اپنے بکرے سمیت ہمارا منتظر تھا ۔ جیسے ہی جندوڈے نے مہمان سرا کے سامنے ٹریکٹر روکا وہ اپنے بکرے کو ہنکاتا ہوا ہم پر امڈ آیا ۔

"کیا بنا میرے لال ــــ ؟" اس نے فرطِ جذبات میں جندوڈے کے دونوں بازو پکڑ لیئے ۔

"آپ کا کام ہو جائے گا ــــ" جندوڈے نے درویشانہ انداز میں سر جھٹک کر کہا ــــ "مٹھائی کے پیسے دے آیا ہوں ــــ"

"اللہ تیرا شکر ہے ــــ" نصیر الدین نے بکرے کی داڑھی پہ ہاتھ پھیر کر کہا ــــ "اندازاً بات کب پکی ہو جائے گی ــ ؟"

"بات تقریباً پکی سمجھیں ــــ" جندوڈے نے تیقن سے کہا ــــ "البتہ راز داری کے خیال سے آپ کو پندرہ بیس دن چلّہ کاٹنا پڑے گا ۔"

"کس قسم کا چلّہ ؟ نصیر الدین نے گھبرا کر پوچھا ۔

"یہ چچہ ترکیب استعمال ــــ" جندوڈا ہاتھ اٹھا کر بولا ــــ "آپ کی سسرال کی طرف سے بھیجا جائے گا ــــ ہونے والی سسرال کی طرف سے ــــ"

"تمہارے منہ میں گھی شکر ــــ" نصیر الدین نے خوش ہو کر بکرے کے سر پہ اور اس کے بعد جندوڈے کے سر پہ ہاتھ پھیرا ۔ پھر چونک کر بولا ــــ

"تمہارے بال گیلے کیوں ہیں ــــ"

"چلّے کا عمل ــــ" جندوڈا آسمان کی طرف انگلی کھڑی کر کے بولا ــــ "آپ کے لیے رشتے کی بات چیت کے بعد حکم ہوا نہر میں نہاؤ ۔ اور تین سو ستر مرتبہ غوطہ لگاتے ہوئے سب کا بھلا سب کی خیر کا ورد کرو ۔"

چنگھاڑ بلند کی اور میری طرف لپکا ــــ" سبحان اللہ ــــ سبحان اللہ ــــ تیری شان نیاری۔ تو نے دنیا بنائی ساری۔ ایک مہربان کی شکل نظر آئی پیاری۔ شکر ہے پروردگار کا جس نے مکھڑا دکھایا سرکار کا ــــ"

یہ کہہ کر وہ جھومتا جھامتا مجھ سے معانقے کے لیے گتھم گتھا ہو گیا۔ اس کے ساتھیوں کے چہروں پر بھی طمانیت کی چمک اُبھر آئی۔ اور اطمینان کے اظہار کے طور پر انہوں نے اپنے اپنے کاندھوں سے طبلے طنبورے اور دیگر تام تو بڑہ اتارنا شروع کیا۔

بدرالدین مشکوک نے ہمارے معانقے میں کھنڈت ڈالتے ہوئے کہا "بات صرف اتنی تھی کہ میں نے آپ جناب سے پرانی واقفیت کا ذکر کر دیا۔ اس پر آپ جناب ناراض ہو گئے ــــ" اس نے مست قلندر ہاتھی کی طرف اشارہ کیا۔

"واقفیت؟" مست قلندر بلبلا کر بولا "عالی جاہ ــــ آپ نے تو مجھے چور، ڈکیت، قاتل اور مفرور پتہ نہیں کیا کچھ بنا دیا تھا۔ وہ تو اللہ نے عزت رکھ لی کہ یہ فرشتہ صورت انسان یہاں موجود تھے ــــ" اس نے میری طرف عاجزانہ انداز میں اشارہ کیا ــــ "ورنہ عالی جاہ آپ نے تو مجھے اور میرے محترم ساتھیوں کو حوالۂ پولیس کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی ــــ" مسکین علی اس موقعہ پر آگے آیا اور جیب سے محدب شیشہ نکال کر مست قلندر کو فوکس میں لیتے ہوئے بولا ــــ "میں پھر کہوں گا کہ معاملات شک و شبہے سے ــــ بالاتر نہیں ــــ آپ لوگوں کو دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا۔ کہ مشکوک حرکات و سکنات رکھنے والی چند اجنبی ہستیاں ہمبھیریاں والی میں وارد ہو چکی ہیں ــــ"

مست قلندر روہانسا ہو گیا۔ مجھ سے فریادی لہجے میں بولا "عالی جاہ یہ دونوں حضرات بڑی دیر سے ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ براہِ کرم ان سے ہماری جان چھڑوائیے۔ اس حبسِ بیجا سے رہائی دلوائیے ــــ"

"مجھے تم پہ ناز ہے ــــ" نصیرالدین نے پھر بکرے کے سر پہ ہاتھ پھیر کر جندوڈے سے کہا ــــ "دنیا دیکھے گی کہ چچا نصیرالدین اپنے پیارے بھتیجے کے لیے کیا کرتا ہے ــــ"

"فی الحال آپ آرام کریں ــــ" جندوڈے نے جمائی لے کر کہا ــــ "کچھ ہار پھول اور مٹھائی ممبئی والی خالہ جان کی طرف بھجوانی ہے اور میری جیب ــــ"

نصیرالدین نے اس کی بات کاٹ دی۔ کرتے کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا ــــ "اس کی تم فکر نہ کرو۔ کام جیب تک نہیں ہو جاتا رسمی اخراجات کی روائتی ذمہ داری نصیرالدین پر ہے چاہے اسے جان پر کھیلنا پڑے ــــ فی الحال ہار پھول اور مٹھائی کی مد میں میری طرف سے یہ نذرانۂ عقیدت حاضر ہے ــــ"

میں تاریکی میں اچھی طرح دیکھ نہیں سکا کہ کتنے نوٹ اُدھر سے اِدھر منتقل ہوئے۔

○

صبح ہی صبح شور سے میری آنکھ کھل گئی۔

نیچے صحن میں بہت سے لوگوں کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں ایک بلغمی، گھمبیر اور آشنا آواز ان آوازوں میں خاصی نمایاں تھی۔

"عالی جاہ ــــ" وہ آواز فریاد کر رہی تھی ــــ "یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے پہلے خط لکھ کر بلایا جاتا ہے۔ پھر تفتیش ڈال دی جاتی ہے ــــ"

میں کن سوئیاں لیتا ہوا نیچے اُترا۔

کیا دیکھتا ہوں کہ مست قلندر ہاتھی اور اس کے ساتھی، مسکین علی بدرالدین مشکوک چھوٹے شیطان اور دیگر چند لوگوں کے نرغے میں ہیں۔ سیڑھیوں سے مجھے نیچے اترتے دیکھ کر مست قلندر ہاتھی نے دونوں ہاتھ رقص کے انداز میں ہرا کر ثنا سائی کی ایک

بدرالدین مشکوک نے اپنی فلیٹ اتار کر لہرائی۔ بولا ــــ "آپ جناب غلط بیانی نہ فرمائیں۔ میں نے صرف اتنی عرض کی تھی کہ آپ جناب کو کہیں پہلے دیکھ چکا ہوں غالباً پھانسی کی کوٹھری میں ــــ"

"عالی جاہ ــــ" مست قلندر چیخ اٹھا ــــ "ملک جندوڈا خاں صاحب کو بُلائیے اور میرے لیے پانی منگوائیے۔ حالت خراب ہو رہی ہے ــــ" میں نے مسکین علی سے مخاطب ہو کر کہا ــــ "آپ فکر نہ کریں یہ اپنے ہی آدمی ہیں۔ انہیں خط لکھ کر بلوایا گیا ہے تاکہ شادی کے پُر مسرت موقعہ پر اپنے فن کا مظاہرہ کریں ــــ"

یکایک چھوٹا شیطان قلکاری مار کر ہنسا ــــ تالی بجا کر بولا ــــ "اوئے واجہ وجانے والے آ گئے۔ ہئی شاپا ــــ ہن کھڑکن گے ڈھول ــــ"

یہ کہہ کر وہ بے طرح اچھلنے اور منہ سے طبلے کی آوازیں نکالنے لگا۔ حاضرین نے خوش دلی سے اس کی طرف دیکھا۔ مست قلندر ہاتھی دانت لچکچانے لگا۔ بولا ــــ "عالیجاہ ان دونوں صاحبان کے علاوہ اس چھوٹی سی مخلوق نے بھی میری خاصی مٹی پلید کی ہے۔ یہ کافی دیر سے میرے پیچھے منہ سے طبلے کی بے سُری آواز نکالتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ کیا اس کا کوئی ولی وارث نہیں ــــ؟"

اچانک کھلے ہوئے دروازے سے سائیکل کا اچھلتا ہوا مہیب داخل ہوا ــــ پھر سالم مگر ڈگمگاتی ہوئی سائیکل پر دونوں پاؤں الٹی وی کی شکل میں اٹھائے خالو جان قانونی کا نزول اجلال ہوا۔ دھڑام سے وہ حسبِ عادت سائیکل سمیت فرش پر گرے اور کپڑے جھاڑتے ہوئے اُٹھ کر ہماری طرف آئے "عزیزم ــــ" انہوں نے آتے ہی پوچھا ــــ "ابھی کچھ دیر پہلے میری اولاد نرینہ کے بارے میں سوال و جواب ہو رہے تھے ــــ؟"

چھوٹے شیطان نے انہیں دیکھتے ہی مارے خوشی کے ایک جگر خراش اور دلدوز

چیخ ماری۔ اور بھاگ کر ان کی گود میں چڑھ بیٹھا۔ اس ناگہانی حملے سے خالو جان لڑکھڑائے اور دھپ سے زمین پر گرے۔ اٹھتے ہی انہوں نے کپڑے جھاڑے اور اسے پرے دھکیلا ــــ "نورِ چشم، راحت جان۔ طولِ عمرہٗ ــــ" وہ بزورِ بازو اسے پرے دھکیلتے ہوئے بولے "ہزار بار تجھے اور تیری والدہ ماجدہ کو سمجھا چکا ہوں کہ جب میں کسی اہم معاملے پر مصروفِ گفتگو نظر آؤں تو میرے ساتھ لاڈیاں مت کیا کرو۔ اب آپ پرے دفعہ ہوں اور مجھے بات کرنے دیں۔"

"ابا ــــ" شیطان نے منہ پھاڑ کر عجیب خوفناک آواز میں کہا "اوئے ابا ــــ تو کہاں مر گیا تھا ــــ؟ بھج بھج کے ہم پریشان ہو گئے ــــ"

"جگر گوشۂ من ــــ" وہ بے اختیار اس کا سر سہلا کر بولے "میں گھر سے ہو آیا ہوں اور آپ کی والدہ ماجدہ نیز دیگر ضروری افراد خانہ کو وجوہات عرض کر آیا ہوں۔ تاہم آپ بھی سُن لیں کہ میں شہر چلا گیا تھا۔ عدالتی پیشی بھگتنے"

"کمال ہے ــــ" اب میں نے بیچ میں مداخلت کی۔ "آپ اچانک ہی غائب ہو گئے۔ کسی کو اطلاع تک نہ دی ــــ"

خالو جان قانونی شیطان کا ایک کان مروڑ کر اسے چومتے ہوئے بولے "آپ کی خالہ جان صاحب ایک بھلکڑ خاتون ہیں۔ انہیں کوئی بات یاد نہیں رہتی۔ حالانکہ اس فرشتہ خصلت عورت کو میں نے روانگی سے پہلے گھر کے اخراجات دے کر واضح طور پر بتا دیا تھا کہ شہر جا رہا ہوں۔ اور تین چار دن بعد واپسی ہو گی۔ خیر ــــ" وہ پھر سب کی طرف متوجہ ہوئے ــــ "یہ محکمۂ سراغ رسانی یہاں کیا کر رہا ہے۔ اور یہ صحت مند حضرات کون ہیں ــــ؟"

"مست قلندر ہاتھی اور ان کے ساتھی ــــ" میں نے تعارف کرایا ــــ "معروف قوال ــــ علم موسیقی کے ماہرین۔ گلوکار اور اداکار ــــ"

خالوجان قانونی نے سب سے فرداً فرداً ہاتھ ملایا ۔ مست قلندر ہاتھی ان کی ڈرامائی آمد سے قدرے محجوب اور شرمندہ تھا۔ مصافحہ کرتے ہوئے جھک کر عاجزی سے بولا ۔ "مجھے عالی جاہ معاف فرمائیں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ انتہائی سنسوڑ، خوش اخلاق، ذہین اور مؤدب بچہ آپ کا ہے۔ مبارک باد قبول فرمائیں ۔"

خالو جان نے لپک کر مست قلندر کو گلے لگا لیا۔ بولے ۔ "خیر مبارک ۔ چشم ما روشن دلِ ما شاد ۔"

شیطان یکایک چیخ اُٹھا۔ بولا ۔ "ابا ۔ یہ مراثی ہے مراثی۔ واہے وجائے گا ۔ ہاہاہا ۔ تان دھنا دھن ۔ دھکا دھک ۔ چمڑچوں ۔" مست قلندر نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور کر دیکھا۔ بلبلا کر خالوجان سے عرض یاد کی ۔ "عالی جاہ اس انتہائی مؤدب اور خوش اخلاق بچے کی اِملاء درست کروائیں ۔"

"انشاء اللہ ۔" خالوجان نے وعدہ کیا ۔ "ہم جلد ہی ماسٹر دین محمد آزمودہ کے پاس اسے پڑھنے بھیجیں گے۔ آپ فکر نہ کریں ۔" پھر اس کے ساتھیوں کی طرف مڑ کر بولے ۔ "عزیزم ۔ آپ لوگ کھڑے ہمارا منہ کیا دیکھ رہے ہیں ۔ اندر تشریف لے جائیں ۔ اور اپنا ساز و سامان رکھ کے ہاتھ منہ دھوئیں میں عزیزم جندوڈے کے ہمراہ ناشتہ وغیرہ لے کر آتا ہوں ۔"

یہ کہہ کر انہوں نے سائیکل اٹھائی اور اس پر سوار ہونے سے پہلے شیطان کو آواز دی ۔ "نورِ چشم، راحت جان۔ طولعمرہ ۔ تشریف لائیں اور سائیکل پر سوار ہو کر میری عزت افزائی فرمائیں ۔"

شیطان سہم گیا۔ چیخ مار کر بولا ۔ "نہ نہ ابا ۔ تو گرا دے گا ۔"

"نہیں گراؤں گا طولعمرہ ۔" خالوجان نے پچکار کر لجاجت سے کہا۔ "تشریف لائیے ۔" "نان ۔" طولعمرہ نے پاؤں سختی سے زمین میں گاڑ دیئے ۔ "ناں"

بدرالدین متسکوک نے کہا ۔ "بچے کا دل آمادہ نہیں ۔ اسے خوفناک تجربات پر مجبور نہ کریں ۔"

"اولاد میری ہے ۔" خالوجان نے بلند آواز سے کہا ۔ "سر سے پاؤں تک میری اولاد ہے اور قانوناً میرے حکم کی پابند ہے۔ میں اسے قانونی باریکیوں سے آگاہ رکھنا چاہتا ہوں ۔ آؤ فرزند دلبند ۔"

"جا پُتر ۔" مسکین علی نے شیطان کے سر پہ ہاتھ پھیرا ۔ "اللہ کے حوالے ۔ باپ کی بات مان لے ۔"

"ناں ۔ ناں ۔" طولعمرہ راحت جان نے حلق سے چنگھاڑ سے ملتی جلتی آواز نکالی ۔ "ابا ضرور گرائے گا ۔ جسے بٹھاتا اِسے گراتا ہے ۔"

"حق حق ہے ۔ حق حق ہے ۔" اچانک دروازے کی طرف سے آواز آئی اور پیر کرامت علی شاہ مولوی محمد صدیق خاکی کی معیت میں اندر داخل ہوئے۔ آناً فاناً فضا کا رنگ بدل گیا۔ سب سے پہلے طولعمرہ نے لپک کر پیر صاحب کے ڈنڈے کو بوسہ دیا۔ پھر دیگر حضرات نے اس کی تقلید کی۔ خالوجان قانونی نے سائیکل دوبارہ زمین پر ٹکا دی اور ہاتھ جھاڑتے ہوئے دونوں بزرگ ہستیوں کی طرف لپک کر انہیں تعظیم دی ۔ "گھر سے غائب نہ رہا کریں بہ خوردارم ۔" پیر صاحب نے خالوجان کے جھکے ہوئے کاندھوں پہ ایک ڈنڈا رسید کر کے کہا ۔ "گھر والی کے حقوق پورے کریں۔ اولاد کا خیال رکھیں۔ دُنبہ فارغ کر دیں ۔"

خالوجان نے حیرت سے منہ پھاڑ کر کہا ۔ "پیر و مرشد ۔ دُنبہ تو خود ہی رسّہ تڑوا کر اپنے مالک کے پاس جا پہنچا ہے۔ یہ اطلاع تو مجھے آتے ہی مل گئی تھی ۔"

"بہر حال ۔" پیر صاحب نے داڑھی پہ ہاتھ پھیر کر کہا ۔ "حقدار کو اس کا حق مل گیا ہے۔ یہ بہت اچھا ہوا۔ حق حق ہے۔ کیوں قبلہ مولانا صاحب ؟"

مولوی صاحب نے گردن ہلا کر جھومتے ہوئے کہا ــــ "اس میں کیا شک میرے محترم مگر مسجد کا چندہ تاحال قالوی صاحب پر واجب الادا ہے۔ اس کی ادائیگی سب باتوں پر مقدم ہے۔ کیا فرماتے ہیں پیر صاحب قبلہ بیچ اس مسئلے کے؟"

"حق حق ہے ــ حق حق ہے ــ" پیر صاحب نے آسمان کی طرف انگلی کھڑی کر کے کہا ــ "اللہ ہو ــ جو دینا ہے سو دینا ہے۔ اس میں تاخیر کیسی اور ٹال مٹول کیوں ــ یہ کہہ کر پیر صاحب نے ڈنڈا لہرایا۔

"بے فکر رہیں پیر و مرشد ــ" خالو جان گھبرا کر بولے ــ "ضرور دوں گا بس ایک دو روز کے اندر آپ کا کام ہو جائے گا"

"ہمارا کام؟" پیر صاحب نے گرج کر کہا ــ "سنتے ہیں قبلہ مولانا صاحب کیا کفر کی باتیں ہو رہی ہیں ــ اللہ ہو ــ"

"توبہ توبہ ــ" مولوی صاحب اپنے گال تھپتھپا کر بولے "نوبت بہ اینجا رسید ــ رسیدے کہ بود دے دلے بخیر گزشت ــ آیئے نکل چلیں۔ کفر کے اس کلمے نے ماحول خراب کر دیا ہے ــ"

یہ کہہ کر دونوں بزرگ جانے کے لیے مڑے اچانک ان کی نظر مہمان خانے میں رکھے ہوئے تمام تو بڑے پر پڑ گئی ــ پیر صاحب ٹھٹکے ــ ایک طبلے کے قریب جا کر کچھ دیر غور کیا پھر طبلے پر ڈنڈا رسید کیا۔ بڑی خوفناک آواز برآمد ہوئی۔ طوائفوں نے خوشی سے بیحال ہو کر ایڑیوں پر گھوم کر رقص کیا اور تالیاں بجائیں "عالی جاہ" مست قلندر گھبرا کر بولا ــ "یہ آپ کیا کرنے لگے ہیں۔ بڑے قیمتی طبلے ہیں عالیجاہ ــ"

"فسق و فجور ــ" پیر صاحب نے ایک ڈنڈا طبلے پر اور دوسرا مست قلندر کی پیٹھ پر رسید کرتے ہوئے کہا ــ "خالصتاً فسق و فجور ــ"

بے حیائی اور بے عزتی کے آلات ــ" مولوی صاحب ترکی بہ ترکی بولے ــ شمشیر و سناں اول طاؤس رباب ــ آخر ــ غضب خدا کا اب حکیم حاجی صاحب کے مہمان خانے میں یہ گل کھلنے لگے ہیں۔ شہر سے طائفے منگوائے جاتے ہیں۔ عیش و عشرت کے لیے۔ حسن و عشق کا بازار گرم کر دیا گیا ہے ــ مجرے کی محفلیں سجائی جانے لگی ہیں۔ قہر الٰہی نہ ٹوٹے تو اور کیا ہو ــ جبھی میں سوچ رہا تھا کہ بارشیں کیوں نہیں ہو رہیں۔ اب معلوم ہوا کہ بارشیں بند کروانے کے آلات تو یہاں پڑے ہیں۔ لاحول ولا ــ"

"قبلہ پیر صاحب" میں نے جلدی سے کہا ــ "محترم مولوی صاحب آپ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ ساز و سامان مجرے کے لیے نہیں محفل سماع کے لیے منگوایا گیا ہے ــ"

"عالی جاہ ــ" مست قلندر نے ہاتھ باندھ کر کہا ــ "ایسی شاندار قوالی پیش کروں گا کہ حضور کو حال آ جائے گا ــ"

میں نے تائید کی ــ "بے شک ــ یہ بڑی بڑی ہستیوں کو حال کھلوا چکے ہیں۔ کئی وزیر اور سفیر، صنعت کار اور جاگیرداران کے مستقل کرم فرما ہیں۔ انہیں جب حال کھیلنا مقصود ہو تو انہی کو بلاتے ہیں ــ"

دونوں بزرگوں پر اس وضاحت کا خاصا اثر ہوا۔ پیر صاحب کہنے لگے "بزرگانِ دین سماع کی محفلوں کو پسند فرماتے تھے۔ ہم عاجز، حقیر، گناہگار بھی قوالیوں کے شیدائی ہیں۔ چلیے مولانا صاحب قبلہ، حاجی صاحب سے مل کر محفلِ سماع کا پروگرام بنواتے ہیں۔ اللہ ہو ــ"

اتنے میں جند وڈا دھمکا۔ اس کے ہاتھ پیر اور بالوں کے علاوہ مونچھوں میں بھی مہندی لگی ہوئی تھی۔ لہٰذا وہ پنجے اٹھائے ایڑیوں کے بل عجیب انداز میں وارد ہوا۔

سب سے پہلے اس کی نظر مست قلندر ہاتھی پر پڑی۔

"اخاہ ــــ" وہ چونک کر سٹپٹائے ہوئے انداز میں بازو لہرا کر بولا۔ "شہنشاہِ نغمات۔ چین کے شہزادے۔ کھوئے ہوئے فنکار۔ مست قلندر میرے یار۔ تم کہاں؟"

مست قلندر خوشی سے باچھیں پھیلا کر بولا ــــ "عالی جاہ۔ آپ نے بلایا اور بندہ سر کے بل آیا ــــ"

جندوڈے کی خوش اخلاقی رفو چکر ہو گئی۔ تیوری چڑھا کر بولا ــــ "میں نے کب بلایا ــــ کوئی ثبوت؟"

مست قلندر کی باچھیں ایک دم سمٹ گئیں۔ چہرے پر خجالت، گھبراہٹ اشتعال اور بے دلی کے سائے لہرا گئے۔ جلدی جلدی جیبوں میں ہاتھ مار کے خط ڈھونڈنے لگا۔

اس کی گھبراہٹ اور پریشانی دیکھ کر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے جندوڈے کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر سرگوشی کی۔ "خط میں نے ہی روانگی سے قبل پوسٹ کیا تھا۔"

جندوڈا دبے دبے جوش سے بولا ــــ "مشورہ کس سے لیا تھا؟"

میں نے کہا ــــ "میری جان۔ جندوڈے، تم تو گاؤں میں تھے۔ مشورہ کون دیتا۔ ہاتھی کو یہاں بلانے کا واحد مقصد تمہاری شادی کی رونقوں میں مزید اضافہ کرنا تھا ــــ"

"یہ ہاتھی ــــ" جندوڈا ناک سکوڑ کر بولا ــــ "اور اس کے ساتھی۔ اوّل نمبر کے دغا باز اور لالچی ہیں۔ ان کے معاوضے کا معاملہ کھٹائی میں پڑ سکتا ہے۔ کیونکہ حکیم صاحب ایک ایک پیسہ پھونک پھونک کر خرچ کرتے ہیں۔"

"پھر ــــ؟" میں کنکھیوں سے مست قلندر کی طرف دیکھا جو بدستور نفی میں گردن ہلا ہلا کر اپنی جیبیں الٹ پلٹ کر رہا تھا۔

"پھر کچھ نہیں ــــ" جندوڈا قطعیت سے بولا ــــ "چین کے یہ شہزادے ہمارے مہمان ہیں۔ مگر معاوضہ گاؤں والوں کو قوالیاں سنا کر وصول کریں گے۔ شہر کا یہ ثقافتی طائفہ خیر سگالی مشن پر یہاں آ ہی چکا ہے تو اپنے لیے فضا خود ہی ہموار کرے گا ــــ"

پیر صاحب مست قلندر کو مایوسانہ انداز میں جیبیں الٹ پلٹ کر دیکھ کر بولے۔ "بس بس۔ اب مزید کسی جیب کو کھنگالنے کی ضرورت نہیں بھمبھیریاں والی کے لوگ بزرگانِ دین کی باتیں سننے والوں کو پسند کرتے ہیں۔ آپ لوگ شوق سے قوالیوں کی تیاری کریں۔ حکیم صاحب خوفِ خدا رکھنے والی ہستی ہیں۔ جب آپ کی بابت سنیں گے تو خوش ہوں گے اور حسبِ توفیق آپ کی امداد کریں گے ــــ"

"بے شک ــــ" مولوی صاحب نے تائید کی ــــ "حکیم صاحب ہی نہیں سارا گاؤں آپ کی امداد کرے گا۔ بھمبھیریاں والی سے کوئی فقیر، قوّال یا بہروپیہ کبھی خالی ہاتھ واپس نہیں گیا۔ کرائے جو گے پیسے ضرور لے گیا۔"

اِن خیر مقدمی مکالموں کے دوران مست قلندر کا رنگ کئی بار فق ہوا۔ کئی بار کئی بار اس کے ہونٹ نیچے لٹکے۔ کئی مرتبہ اس نے زبان دانتوں تلے دبائی۔ بالآخر گلوگیر لہجے میں خود سے مخاطب ہو کر بولا ــــ "عالی جاہ یہ ہم کہاں پھنس گئے۔ آرٹ کی ایسی سرپرستی کا تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ گئے تھے نمازیں بخشوانے روزے گلے پڑ گئے۔ خیر۔ دس دس بیس پیسے بھی لوگوں نے بطور امداد دیئے تو شہر تک کا خرچہ نکل آئے گا۔ یا اللہ۔ تیرا ہی آسرا ــــ"

یکایک جندوڈے کی نظر خالو جان قانونی پر پڑ گئی۔ پہلے تو اس کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ پھر اس نے ایک دھاڑ مار کر مہندی رنگے ہاتھوں سے

خالو جان کو لپک کر دبوچ لیا ۔ گلے لگا کر بولا "میرے مجازی والد محترم ۔۔۔ آپ مجھے چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے ۔ واپسی کب ہوئی ؟

آپ کو اغواء کرنے والوں نے زرِ تاوان کے طور پر کتنی رقم مانگی ہے ۔ اس رقم کی بابت آپ نے کیا سوچا ہے ۔ کیا آپ نہر والی زمین بیچ دیں گے ؟"

"عزیزم ۔ دھیرج ۔۔۔" خالو جان نے اس کے کاندھے تھپتھپائے ۔۔۔

"دھیرج، بفضلِ تعالیٰ سب خیریت ہے ۔ میں شہر چلا گیا تھا ۔ مقدمے کی پیشی بھگتانے ۔ آپ کی مجازی والدہ محترمہ و ماجدہ کو بتا کر گیا تھا ۔۔۔ وہ شیر کی نجی، دلیر خاتون آپ کی خالہ اور میری شریکِ حیات بھول گئی ۔۔۔"

جندوڈے کو اس اطلاع پر مایوسی ہوئی کہ خالو جان کو اغوا نہیں کیا گیا تھا ۔ وہ اپنی مرضی سے گئے تھے ۔ نیز زرِ تاوان کا کوئی قصہ نہیں اور نہر والی زمین بال بال بچ گئی ہے ۔ بولا ۔۔۔ "بہر حال جب آپ کہیں جایا کریں تو گاؤں کے دس بیس آدمیوں کو بتا کر جایا کریں تاکہ خالہ جان پریشان ہو کر آسمان سر پر اٹھانے سے محفوظ رہیں ۔۔۔" پھر وہ حاضرین کی طرف مڑ کر بولا ۔۔۔ "آپ سب لوگ جہاں کھڑے ہیں ۔ وہیں بیٹھ جائیں ۔ ناشتہ آرہا ہے ۔۔۔"

جب ہم ناشتے کے لیے بیٹھے تو خالہ قانونی سرکتے سرکتے میرے قریب آگئے ۔ اِدھر اُدھر محتاط آنکھوں سے دیکھ کر سرگوشی کی ۔ بولے "عزیزم ۔ آپ کی اطلاع درست نہیں تھی ۔۔۔"

میں نے چونک کر پوچھا ۔۔۔ "کونسی اطلاع ۔۔۔؟"

"وہی فلموں والی ۔۔۔" وہ آہستہ سے بولے ۔۔۔ "میں تین دن تک اس نامراد ہوٹل میں جاتا رہا ۔۔۔ مگر انہوں نے تو کچھ بھی نہیں دکھایا ۔۔۔"

میں نے کچھ کہنا چاہا ۔ مگر انہوں نے میرا بازو دبا کر کہا ۔۔۔ "بہر حال ۔ بزرگوں سے غلط بیانی سے تنک کریں مگر ان کے جذبات سے نہ کھیلیں ۔ اس قسم کی جھوٹی اطلاع غیر قانونی کہلاتی ہے ۔ آئندہ خیال رکھیں ۔۔۔"



وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

جے ڈبلیو بندھن سنٹر





"ایک لرزہ خیز خبر ——" جندوڈے نے پُرجوش انداز میں اخبار میرے سامنے لہراتے ہوئے کہا —— "چین کے شہزادے۔ عظیم دانشور۔ میرے دوست پروفیسر بی کے بٹالہ —— تمہارے لیے ایک نیا پروجیکٹ ——"

میں نے بے صبری سے اخبار جھپٹ لیا — ضرورت ہے کے کالموں میں چند سطروں کے ایک اشتہار پر جندوڈے نے بڑا سا دائرہ لگا رکھا تھا۔ ایک شادی دفتر کو کسی خریدار یا پارٹنر کی ضرورت تھی۔ اشتہار مس گل بنفشہ بی اے کی طرف سے دیا گیا تھا اور ایڈریس کے ساتھ اس کا فون نمبر درج تھا۔

"مس گل بنفشہ بی اے ——" جندوڈا اشتہار پر انگلی رکھ کر بولا —— "ایک بلبل ہزار داستان، پریوں کی ملکہ، جذبات کی رانی۔ میں اس سے فون پر ابتدائی معاملات طے کر چکا ہوں ——"

"ابتدائی معاملات؟" میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"تقریباً نصف معاملات ——" وہ اطمینان سے بولا —— "طے پایا ہے کہ اگر میں اس سے شادی کا وعدہ کر لوں تو وہ مجھے بغیر کسی سرمائے کی شمولیت کے اپنا پارٹنر بنانے پر تیار ہے۔"

"لائف پارٹنر کہ بزنس پارٹنر ——؟" میں نے بھویں اچکا کر پوچھا۔

"دونوں ——"

"یہ کس طرح ممکن ہوا ——؟" میں نے حیرت سے پوچھا —— "کیا تم مس گل بنفشہ سے مل چکے ہو —— کیا وہ تمہارے بارے میں سب کچھ جانتی ہے ——"

"ان دونوں میں سے کوئی بات نہیں ہے ——" جندووڈا مطمئن انداز میں سر ہلا کر بولا۔ "ٹیلی فون پہ لچھے دار گفتگو کے بعد اس نے مجھ پہ ہزار جان سے فریفتہ ہونے کا اعلان کر دیا ہے۔ کل کے اخبار کے لیے اس نے دوسرا اشتہار بھی فون پہ پڑھ کر سنا دیا ہے کہ ادارے کو مطلوبہ پارٹنر دستیاب ہو گیا ہے۔ لہذا پارٹیاں زحمت نہ فرمائیں ——"

"کمال ہے ——" میں نے حیرت سے کہا —— "ایسا صرف ایک ٹیلی فونک گفتگو پہ ہوا۔ مجھے یقین نہیں آتا جندووڈے میری جان ——"

"ایسا ہو چکا ہے ——" وہ ایک ایک لفظ پہ زور دے کر بولا —— "مگر ایک نہیں دو ٹیلی فونک رابطوں کے بعد —— ہر بار ہم نے تیس تیس منٹ تک اطمینان سے گفتگو کی ——"

"تیس تیس منٹ تک ——" میں حیرت سے اچھل پڑا —— "کہاں ہے وہ پی سی او جو اپنے کرمفرماؤں کو اتنے لمبے ٹیلی فون ٹاک کی سہولتیں دیتا ہے ——"

"خیر دین پرچون فروش اینڈ کریانہ مرچنٹ ——" جندووڈے نے انکشاف کیا۔ "ایک گداز دل۔ عاشق مزاج۔ بھینگا دانشور دکاندار۔ وہ دالیں چاول اور پرچون کے دیگر لوازمات بیچنے میں لگا رہا اور میں اطمینان سے گڑ کی بوری پہ بیٹھ کر فون پہ لمبی گفتگو کرتا رہا ——" پھر اس نے اخبار لپیٹ کر احتیاط سے جیب میں ڈال لیا۔ "شام چار بجے چائے پر تم میرے ساتھ مس گل بنفشہ کی مہمانی کا شرف حاصل کر رہے ہو۔ اس کا وسیع و عریض کشادہ بنگلہ اور خوبصورت پھولوں سے مہکتا ہوا لان ہمارا منتظر ہو گا۔" مگر گل بنفشہ کی اقامت گاہ کشادہ بنگلے اور پھولوں سے بھرے

ہوئے لان کی بجائے ایک تنگ و تاریک، سیلن زدہ، قدیم اور خستہ گلی میں نکلی۔ جہاں ملاقاتیوں کو برقی گھنٹی کا بٹن دبانے کے بعد ایک شدید جھٹکا لگتا ہے اور وہ دھڑام سے قریبی گڑھے میں جا پڑتے ہیں —— خاصی دیر بعد دوسری یا تیسری منزل کی خستہ کھڑکی کھلتی ہے اور کوئی ڈانٹ کر پوچھتا ہے —— "کون ہے اوئے؟" گھنٹی کا بٹن دبانے اور برقی رو کا جھٹکا کھا کر گڑھے میں گرنے کے فرائض میں نے انجام دیئے۔ لیکن اوپر سے "کون ہے اوئے" کی بجائے ایک مترنم نسوانی آواز نے پوچھا —— "کون صاحب ہیں؟"

جندووڈا اس وقت بھورے سفاری سوٹ میں ملبوس تھا اور لاشعوری طور پہ بار بار اس کے ہاتھ گلے کی طرف بڑھ کر ٹائی کی ناٹ ڈھونڈ رہے تھے۔ یہ آواز سن کر ہڑبڑا کر پیچھے ہٹا اور اوپر دیکھنے کی دھن میں چھپ سے اس گڑھے میں جا پڑا۔ جس کا طواف مکمل کرنے کے بعد اب میں اپنے لباس سے کیچڑ اور پانی صاف کر رہا تھا ——

"جج —— جج —— جے ڈ ڈ —— ڈبلیو —— ڈبلیو ——" جندووڈے نے اونچی آواز میں اپنی آمد کی اطلاع دیتے ہوئے جھک کر ناگہانی حادثے پر گڑھے اور اس کو غلط جگہ بنانے والوں کے بارے میں کچکچاتے ہوئے آتش خیز جذبات کا اظہار کیا۔ اور کپڑے جھاڑنے لگا۔

"اوپر تشریف لے آئیے ——" مترنم آواز نے کہا۔ "زینہ دائیں طرف ہے۔"

ہم گھٹا ٹوپ اندھیری سیڑھیوں پر چڑھے تو اچانک زینوں میں لگا ہوا ایک بے حد مدھم پیلا اور گرد آلود بلب روشن ہوا۔ جس نے ماحول کی وحشت خستگی اور ویرانی کو مزید گہرا کر دیا۔ بقول جندووڈا —— چار چاند لگا دیئے۔

جندووڈا آگے تھا۔ گیارہویں سیڑھی پہ پاؤں رکھتے ہی غڑاپ سے اس کی پنڈلی

خلا میں جا پڑی اور ماتھا اگلی سیڑھی سے ناک سمیت ٹکرایا۔ "یا اللہ رحم ——" جندوڈے نے دلدوز چنگھاڑ ماری —— "بے حد تباہ کن مورچہ بنایا گیا ہے۔ چین کے شہزادے۔ ہوشیاری سے آنا —— اس سیڑھی کی اینٹیں اور شہتیر غائب ہیں —— غالباً چوروں کو چھپنے کی سہولت دینے کے لیے ——" اچانک دھچکے اور رگڑ سے اس کی پھولی ہوئی ناک متاثر ہو گئی تھی اور متاثرہ علاقہ سُرخ ہو کر چہرے پر سب سے نمایاں نظر آ رہا تھا۔ ہم پھونک پھونک کر، ایک دوسرے کو ٹٹولتے، دھکیلتے اور گھسٹتے ہوئے زینوں کے اختتام پر ایک نسبتاً چوڑی سی جگہ تک پہنچے۔ یہاں دو قدیم دروازے تھے۔ ایک سامنے اور ایک دائیں جانب —— سامنے والا دروازہ غالباً مرکزی دروازہ تھا۔ کیونکہ اس پر ایک پرانی تختی جھول رہی تھی۔

مِس گل بنفشہ بی اے

گل بنفشہ میرج سینٹر (چیئرپرسن)

(نائب صدر)

انجمن تحفظِ حقوق مولیشیاں واسپاں

(سیکرٹری جنرل)

آل ورلڈ ویمن سولائزیشن اینڈ ریزرولیشن آف رائٹس

ہم کچھ دیر کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے اور اکھڑی ہوئی سانسیں ہموار کرتے رہے۔ غالباً ہمارا یہ عمل کسی اندرونی جھری سے بغور ملاحظہ کیا جا رہا تھا۔ کیونکہ جب جندوڈا دوسری مرتبہ اپنے بالوں میں کنگھی کر کے انہیں مزید وحشت ناک بنا چکا تو آواز آئی —— "دائیں طرف کے دروازے سے اندر داخل ہو کر تشریف رکھیں ——" پھر دس گیارہ سال کی ایک کالی کلوٹی چوڑے نتھنوں اور لمبے منہ والی لڑکی نے دروازہ کھولا —— چند لمحوں تک دونوں کو تجسّس، شرارت اور لاتعلقی سے گھورتی رہی۔

پھر اندر آنے کا اشارہ کیا۔

ہم دونوں اندر داخل ہوئے۔ یہ ایک قدیم اور خستہ حال بیٹھک تھی۔ جس کی دیواروں کا پلستر اکھڑ چکا تھا۔ اور اسے چھپانے کے لیے جگہ جگہ وال پیپر اور اخبارات کے رنگین صفحے باریک کیلوں سے ٹھونک کر چپکا دیئے گئے تھے ایک میز پر چند رسالے پڑے تھے اور صوفوں کی بدنمائی اور ہیئت کذائی چھپانے کے لیے ان پر جو کپڑا منڈھا گیا تھا اس کی خستگی اور بدرنگی دید کے قابل تھی۔ سامنے دیوار پر ایک چٹخے ہوئے گرد آلود فریم میں ایک بلیک اینڈ وائٹ تصویر آویزاں تھی۔

پہلی نظر میں میں اسے مدھو بالا کا کوئی فلمی پوز سمجھا۔

"یہ کس فلم سے ہے؟" میں نے کہنی مار کے جندوڈے سے پوچھا۔

جندوڈا تصویر میں کھویا ہوا تھا بولا —— "شاید یہ میرے ابا جی کے بچپن میں بنی ہوئی کوئی فلم ہے۔ کونسی ایکٹرس ہے یہ؟"

فریم کے نیچے ایک چٹ پہ کچھ لکھا ہوا تھا۔ غالباً فلم کا نام وغیرہ میں نے اٹھ کر پڑھا —— "مِس گل بنفشہ بی اے ——"

"مبارک ہو ——" میں نے جندوڈے کو تھپکی دی —— "خود مِس گل بنفشہ ہیں ——"

"خیر مبارک ——" جندوڈے نے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے آہستہ سے کہا —— "میں تو آواز سے ہی تاڑ گیا تھا کہ ——"

اتنے میں لڑکی چائے کی ٹرے اٹھائے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ پلیٹوں میں رکھی ہوئی چیزوں کی ترتیب یہ بتاتی تھی کہ میزبان کو ہمارا خاصی دیر سے انتظار تھا۔ خاص طور پر سموسے اور پکوڑے اس شبہے کو تقویت دیتے تھے کہ ہمارا انتظار کل صبح سے ہو رہا تھا ——

لڑکی ٹرے رکھ کر خاموشی سے چلی گئی۔ جاتے جاتے اس نے بیٹھک کے دروازے کا پردہ بطور خاص برابر کیا۔

"یہ انتظار ——" جندوڈا کلبلا کر بولا —— "چین کے شہزادے۔ علامہ صاحب اِس موقعہ پر کیا فرماتے ہیں؟"

میں نے کہا —— "علامہ صاحب نے اندرون شہر کی ایسی کسی خوفناک گلی میں جا کر کبھی پارٹنر نہیں ڈھونڈے ہوں گے لہٰذا ان کی طرف سے خاموشی ہے ——"

جندوڈے نے ایک بار پھر کنگھا نکالا۔ چاہتا تھا کہ اسے بالوں تک لے جائے کہ پردہ لہرایا اور اس کا ہاتھ قوس کی شکل میں جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ مس گل بنفشہ بی اے اندر داخل ہو چکی تھی۔

بے حد شوخ اور بھڑکدار رنگوں والے سستے سے لباس میں ملبوس۔ میک اپ کی کاک ٹیل میں شرابور —— پینتالیس سے اوپر جاتی ہوئی عمر —— گہرا سانولا رنگ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں جن پر موٹے گول شیشوں کی عینک —— چوڑے نتھنے۔ چہرے پر چیچک کے داغ جو کوشش کے باوجود میک اپ کے رقیق اور انگنت سیالوں سے بھی نہ چھپ سکیں۔

جندوڈا اسے میری طرح گل بنفشہ کی ماں سمجھا —— لیکن میری طرح چپ نہ رہ سکا۔ تعظیماً اپنی جگہ سے اُٹھ کر سر پہ ہاتھ پھروانے والے انداز میں سر جھکائے آگے بڑھا۔ بولا —— "خالہ جان سلام عرض کرتا ہوں ——"

خاتون نے اِس سلام کا کوئی تسلی جواب نہیں دیا۔ ایک کرسی کھینچ کر دھپ سے اس پر بیٹھتی ہوئی بولی —— "جے ڈبلیو خان صاحب کون ہیں؟"

جندوڈے نے مؤدب ہو کر سینے پر ہاتھ رکھا۔ قدرے جھکا۔ بولا —— "میں ہوں خالہ جان —— آپ کا فرزند ——"

خاتون اچانک چھتیس ملی میٹر توپ کے گولے کی طرح پھٹ پڑی بولی۔

"یہ آپ نے کیا رٹ لگا رکھی ہے۔ خالہ جان، خالہ جان —— میں مس گل بنفشہ بی اے بقلم خود ہوں۔"

جندوڈا ڈگمگا گیا۔ ہکلا کر بولا —— "پپ پپ —— آپ آپ؟"

"جی ہاں میں" —— خاتون نے بڑی سریلی آواز میں کہا —— "کوئی شک؟"

"کک کوئی نہیں ——" جندوڈے نے بوکھلا کر کہا —— "کک —— کوئی نہیں ——"

خاتون بڑے اطمینان سے بولی —— "جب کوئی شک نہیں تو پھر نروس بریک ڈاؤن کس لیے —— کھائیں پئیں —— صبح سے چیزیں منگا کر رکھی ہیں۔ آپ کے لیے ——"

پھر اس نے ایک پلیٹ جندوڈے کی طرف بڑھائی۔ دوسری پلیٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی —— "آپ سے میرا تعارف نہیں ہے ——"

جندوڈا خود پر قابو پاتے ہوئے بولا —— "عظیم دانشور، پروفیسر بی کے ٹبالہ۔ میرے مشیرِ امورِ خصوصی اور معاون برائے امورِ عمومی ——"

"اِن کا ذکر آپ نے فون پر تو نہیں کیا تھا ——" مس گل بنفشہ نے کہا۔

میں نے گھور کر جندوڈے کو دیکھا۔ اور انتقاماً دو گلاب جامنیں اپنی پلیٹ میں ڈالیں۔ وہ اِن عاشقوں میں سے ہے جو مہم کے آغاز سے پہلے ہر شخص پہ شبہے کی نظر رکھتے ہیں اور اختتام پر ہر شخص سے ہمدردی کی امید ——

"بہرحال ——" گل بنفشہ نے پیالیوں میں چائے انڈیلتے ہوئے کہا —— "آپ نے مجھے اور میں نے آپ کو دیکھ کر پاس کر دیا ہے اب بتائیں اگلا پروگرام کیا ہے ——؟"

جندوڈے نے امداد طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ بولا —— "یہ تو اب آپ پر منحصر ہے کہ آپ کیا چاہتی ہیں ——؟"

گل بنفشہ نے بے دھڑک کہا —— "شرعی نکاح۔ حق مہر ایک لاکھ سے کم نہیں

رکھواؤں گی ——"

جندوڈے کے ہاتھ سے پلیٹ گرتے گرتے بچی۔ بولا —— "لاکھ روپے کس چیز کے ؟"

"حق مہر ——" گل بنفشہ میز پر مکہ مار کر بولی —— "لاکھ سے ایک پائی کم نہیں ہوگی۔ یہ ہماری خاندانی روایت ہے ——"

جندوڈے کے چہرے پر زلزلہ سا آیا —— نتھنے پھلا کر بولا —— "ہماری بھی خاندانی روایت ہے۔ ہم پانچ لاکھ سے کم پر نہیں مانتے ——"

گل بنفشہ خوشی سے اچھل پڑی۔ بولی —— "یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ چلو طے ہو گیا مہر پانچ لاکھ ——"

"مگر ——" جندوڈا ہاتھ اٹھا کر بولا —— "سات لاکھ آپ مجھے نقد دیں گی۔ یہ ہماری خاندانی روایت ہے ——"

"سات لاکھ روپے نقد ——" گل بنفشہ نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا —— "سات لاکھ"

"پورے ——" جندوڈے نے ایک ہاتھ کا پنجہ اور دوسرے ہاتھ کی دو انگلیاں فضا میں بلند کرتے ہوئے کہا —— "نکالیں سات لاکھ روپے۔ میں ابھی مولوی صاحب کو بلا کر پانچ لاکھ روپے کے حق مہر پہ دستخط کرتا ہوں ——"

"مگر ——" گل بنفشہ تھوک نگلتے ہوئے بولی —— "یہ —— یہ کس قسم کا نکاح ہے ؟ نکاح نہ ہوا یہ تو کاروبار ہو گیا —— پانچ کے بدلے سات ——"

"مجبوری ہے ——" جندوڈے نے آہ بھر کر کہا —— "خاندانی روایت پر آنچ آ جائے گی۔ میں کوئی معمولی ٹٹ پونجیا نہیں۔ صاحب جائیداد شخصیت ہوں۔ کھیت ہیں۔ حویلی ہے۔ مکانات ہیں۔ دکانیں ہیں۔ اور دس لاکھ روپے کی انشورنش پالیسی ہے۔ کیوں پروفیسر بی کے بٹالہ —— عظیم دانشور —— بولتے کیوں نہیں ؟"

جندوڈا اپنی رو میں بہہ نکلا تھا۔ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ بولا۔

"میرا خیال ہے ایک آئٹم پر بات ہو چکی ہے اب دوسرے آئٹم پر بات ہونی چاہیئے۔ میرا مطلب ہے بزنس پارٹنر شپ پر ——"

گل بنفشہ خرخراہٹ آمیز سانسیں لے رہی تھی۔ ہانپتے ہوئے بولی —— "میرا بلڈ پریشر ہائی ہو رہا ہے۔ دل ڈوب رہا ہے۔ پانی ——"

جندوڈے نے فوراً اسے پانی کا گلاس پیش کیا۔

چند گھونٹ پینے کے بعد وہ کرسی پہ ڈھیر ہو گئی۔ بولی —— "پارٹنر شپ کے لیے میری وہی شرط ہے پہلے نکاح ——"

"نکاح بھی ہو جائے گا۔ حوصلہ کریں ——" جندوڈے نے اسے پانی کا دوسرا گلاس بھر کر دیتے ہوئے کہا۔

"پانی نہیں —— نکاح ——" بڑی بی نے گلاس پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"ہو جائے گا ——" جندوڈا ہاتھ اٹھا کر بولا —— "آپ کا نکاح انشاء اللہ آپ کی زندگی ہی میں پڑھوا دیا جائے گا۔ فی الحال میرج سینٹر کا معاملہ طے کریں ——"

گل بنفشہ تھوڑی دیر تک خرّاٹوں سے ملتی جلتی سانسیں لیتی رہی۔ پھر اس نے پرس کھول کر ایک شیشی نکالی شیشی میں سے گن کر پانچ گولیاں نکالیں اور "یا اللہ شافی —— یا اللہ کافی" کا ورد کرتے ہوئے پانی کے ساتھ گولیاں نگل لیں۔ تھوڑی دیر بعد اس کے اعصاب کچھ نارمل ہوئے تو وہ معذرت کرتی ہوئی اندر چلی گئی ——

"چین کے شہزادے ——" جندوڈے نے پریشان ہو کر کہا —— "موقعہ اچھا ہے آؤ بھاگ چلیں ——"

"عبر ——" میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا —— "جو بیج بویا ہے اس کے پھل کا انتظار کرو۔ جو عنقریب تمہاری جھولی میں ٹپکنے والا ہے ——"

"یہ بڑی بی ——" جندوڈا دانت پیس کر بولا ——" یہ خالہ جان قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہے مگر ارمان دیکھو۔ کہتی ہے ایک لاکھ روپے حق مہر پہ نکاح پڑھواؤں گی —— ایک پائی کم نہیں لوں گی۔ تمہارا کیا خیال ہے چین کے شہزادے اس مائی کی کپڑوں اور علیک سمیت کل مالیت کیا ہوگی۔؟"

"مفت بھی مہنگی ہے ——" میں نے آہستہ سے کہا —— "مگر چونکہ ایک بھی پائی خرچ کیے بغیر تمہیں بزنس پارٹنر بنا رہی ہے لہذا سستی ہے۔ مبارک ہو —— قبول کرو ——"

اتنے میں گل بنفشہ بہت سے پمفلٹ، فائلیں، اخبارات کے تراشے اور دو رجسٹر لیے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ سارا ساز و سامان اس نے میز پہ جگہ بنا کے ڈھیر کر دیا۔ اور گل بنفشہ میرج سینٹر کی اب تک کی کارکردگی سے آگاہ کرنے لگی۔ اتنی شادیاں کروائیں۔ اتنی طلاقیں ہوئیں۔ اتنے دیوانی اور فوجداری مقدمے ہوئے۔

جندوڈا اس تفصیل سے گھبرا گیا۔ بولا —— "ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ یہ رجسٹر کھاتے آپ بند کریں اور آمدنی والی سائڈ پہ آئیں۔ آمدنی کی کیا صورت ہے ——؟"

"رجسٹریشن فیسیں اور نذرانے ——" گل بنفشہ نے بتایا —— "بعض مخیر حضرات چوری چھپے بھی ہماری مالی معاونت کرتے ہیں —— الحاج کریم داد چمڑے والے ہمارے مستقل کرمفرما ہیں۔ ہر سال چھ مہینے بعد ایک آدھ نکاح سے شوق فرماتے رہتے ہیں۔"

"پچھلی بیویوں کا کیا بنتا ہے؟" جندوڈا گھبرا کر بولا۔

"خلع یا طلاق ——" گل بنفشہ نے وضاحت کی —— "ہم کوئی غیر شرعی

یا غیر قانونی کام نہیں کرتے۔ اکیلی عورت بلکہ لڑکی ——" وہ تاسف انگیز لہجے میں بولی ——" مردوں کے اس معاشرے میں کامیاب نہیں ہو سکتی جبکہ سرکا سائیں موجود نہ ہو۔ میں آپ کو کیا بتاؤں کہ ہم لڑکیوں کو کیسی کیسی مشکلات سے گذرنا پڑتا ہے ——"

یہ کہہ کر اس نے اپنی مختلف آپ بیتیاں شروع کر دیں کہ کس طرح پجارو جیپ میں سوار ایک صحت مند اور خوبصورت جاگیردار رشتے کی تلاش میں اس کے دفتر آیا اور ہزار جان سے اس پہ عاشق ہو کر فوری نکاح کا مطالبہ کرنے لگا اور حق مہر کے طور پہ اپنی پجارو جیپ اور منہ دکھائی کے طور پہ کلاشنکوف نذر کرنے پہ تیار ہو گیا۔ کس طرح اس نے جان چھڑائی۔ اور کس طرح ایک فلمی ہیرو ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گیا اور کس طرح ایک متمول نوجیز اور نوعمر زمیندار زمینوں کے کاغذات اور رجسٹریاں لیے اس کے پیچھے پیچھے مارا مارا پھرنے لگا۔ نیز کس طرح اس نے ایک معروف سیاست دان سے جو وزیر بننے والا تھا پیچھا چھڑایا۔ پھر اس نے بتانا شروع کیا کہ ٹی وی کا ایک انتہائی مقبول اور صاحب جائیداد خوبصورت ترین اداکار کس طرح اس کے عشق میں مبتلا ہو کر زہر کھانے کی دھمکیاں دینے لگا۔

جندوڈے نے ایک دم ہڑبڑا کر چیخ ماری ——" اُف کاٹ لیا۔ برباد کر دیا۔ کرنٹ مار دیا —— کچھ نہیں چھوڑا ——"

گل بنفشہ گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ بولی ——" یا اللہ خیر سانپ تو نہیں تھا؟"

"غالباً ——" جندوڈے نے پسینہ پونچھتے ہوئے نیچے جھک کر دیکھا۔ پھر ایک آہ بھر کر بولا ——" نکل گیا —— خیر جانے دیں —— اب اجازت؟"

"نہیں نہیں ——" گل بنفشہ جلدی سے بولی —— "آپ لوگ کھانا کھائے بغیر نہیں جا سکتے —— میں آپ کو بتا رہی تھی کہ ہم لڑکیوں کی زندگیاں کتنی ——"

جند وڈے نے بات کاٹ دی۔ بولا —— "تو پھر طے رہا کہ میں آپ کا بزنس پارٹنر بن گیا ہوں ——"

"طے رہا ——" گل بنفشہ نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا —— "ہاں تو میں بتا رہی تھی کہ ایک مرتبہ ایک انتہائی حسین و جمیل نوجوان، ریشمی لباس زیب تن کئے خوبصورت چمکتی ہوئی کار میں سوار میرے پاس آیا۔ مجھے دیکھ کر اس کے دل کی عجیب حالت ہوئی۔ تڑپنے لگا اور کہنے لگا ——"

جند وڈے نے زور سے میری پنڈلی پر چٹکی لی —— ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے ——

"نہیں نہیں ——" گل بنفشہ نے اصرار کرتے ہوئے کہا "رات کا کھانا"

"کل دوپہر کا لنچ ——" جند وڈے نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

"مگر ——" وہ باہر نکلتے نکلتے بولا —— "ادارے کا نام تبدیل کیا جائے گا ——"

"میں بھی کافی دنوں سے یہی سوچ رہی تھی ——" گل بنفشہ نے کہا "کیونکہ میرا نام اتنا مشہور ہو گیا ہے کہ ادارہ پیچھے چلا گیا ہے۔ ابھی پچھلے ہفتے کی بات ہے کہ بڑی بڑی آنکھوں والا ایک خوبصورت جوان، نئی کار میں سوار انگلیوں میں ہیرے کی انگوٹھیاں پہنے ——"

"خدا حافظ ——" جند وڈے نے زور سے کہا اور بے دھڑک دروازے سے باہر چھلانگ لگا دی ——

اس رات دیر تک ہم ادارے کا نیا نام سوچتے رہے۔ آخر جے ڈبلیو بندھن سینٹر پر اتفاق رائے ہو گیا۔

"چین کے شہزادے ——" جند وڈے نے طویل گفتگو سے تھک کر میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا —— "میں نے اندازہ لگایا ہے کہ مائی کے پاس دماغ اور حسن نامی کوئی چیز نہیں۔ اور یہ بی اے بھی نہیں۔ لہٰذا ذہانت بروئے کار لا کر رجسٹریشن فارم کی خوبصورت عبارت اور اشتہارات کے دل آویز مضمون سوچو اور ہر حال میں صبح یہ چیزیں تیار کر کے میرے حوالے کر دو۔"

جند وڈے کے جانے کے بعد میں دیر تک رجسٹریشن فارم کے سوالنامے اور اشتہارات تیار کرتا رہا۔ یہ مجھ ایسے ناتجربہ کار اور مجرد شخص کے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ جند وڈے کی شادی چند خاندانی مسائل کے اچانک اٹھ کھڑے ہونے سے کھٹائی میں پڑنے کے بعد میں جب سے بھمبھیریاں والی سے آیا تھا جند وڈا مسلسل کوئی نہ کوئی پروجیکٹ لے کر میرے گرد منڈلا رہا تھا۔

جے ڈبلیو بندھن سینٹر کے اشتہارات میں عوام الناس کو ان کے مفاد میں مطلع کیا گیا کہ وہ جعلسازوں کے چکر میں نہ پڑیں اور شریفانہ زندگی گذارنے کے لئے شریفانہ طریقے استعمال کریں۔ یعنی جے ڈبلیو خاں سے ملیں جن کے پاس ملکی و غیر ملکی رشتوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔

سوالنامے میں جہاں آپ کی عمر اور آپ کی تعلیم والا کالم تھا اسے میں نے کاٹ دیا —— آمدنی اور پیشے کے کالم بھی حذف کر دیئے۔ اب چھ سات خالی لکیروں کے اوپر ایک فقرہ تحریر تھا —— "آپ کی اپنے بارے میں رائے ——؟"

نیچے کے کالم جوں کے توں رہنے دیے۔ یعنی آپ کا پتہ اور فون نمبر؟
ایک لفظ کا اضافہ یہاں ضروری تھا۔ سو، میں نے کر دیا۔ آپ کے تار کا پتہ ـــ ڈاک کا کوڈ نمبر ـــ ٹیلکس وغیرہ؟
اس کے بعد کا نصف حصہ دفتری استعمال کے لیے تھا۔ یعنی ـــ

میں ـــ تصدیق کرتا/کرتی ہوں کہ مسٹر/مس ـــ نے بطور امیدوار کالم بھر کے رجسٹریشن فیس مبلغ ـــ روپے ـــ ایڈوانس رقم مبلغ ـــ روپے ادا کر دیے ہیں۔ انہیں رجسٹریشن نمبر الاٹ کر دیا جائے ـــ آپ کی عین نوازش ہوگی۔

دستخط تصدیق کنندہ

نوٹ: والدین یا سرپرست درج ذیل خانے پر کریں۔

میں/ہم ـــ رشتہ ـــ عزیزم/عزیزہ ـــ کے رشتے کے سلسلے میں فیس رجسٹریشن مبلغ ـــ روپے بمعہ ایڈوانس مبلغ ـــ روپے ادا کر کے عزیزم/عزیزہ ـــ کار/کے بہتر مستقبل کار/کے متمنی/دعاگو/شکر گذار ہوں/ہیں۔

دستخط والدین/سرپرست

اگلی صبح جندوڈے نے اپنی ہٹ دھرمانہ ترمیم و تنسیخ کے بعد ڈرافٹنگ منظور کر لی۔ ہم تیار شدہ فارموں، پمفلٹوں اور اشتہارات وغیرہ کی اشاعت کے لیے اندرون شہر کی گلی میں واقع ایک پراسرار اور نیم تاریک چھاپہ خانہ میں پہنچے۔ جہاں جعلی چائے کے لیبل، عرس، میلاد اور ڈراموں کے پوسٹر وغیرہ چھپتے تھے۔ اشاعتی ادارے کا مہتمم جندوڈے کا دوست چراغ دین پروانہ تھا۔ اس وقت وہ گرمی کی شدت سے بے حال، قمیض اور بنیان اتارے، لنگی باندھے، چیختا چنگھاڑتا، اپنی ڈھلکی ہوئی توند پر ہاتھ پھیرتا دائیں سے بائیں

گردش کر رہا تھا۔

ہمیں دیکھ کر اس نے پہلوانوں کے سے انداز میں جھٹکے دار مصافحہ کیا اور خاصی دیر اس بات پر گہرے ملال کا اظہار کرتا رہا کہ اصلی دیسی گھی کی نایابی نے نوجوان نسل کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ پھر اس نے ہمارے لیے ایک ایک فٹ کے گلاسوں میں لسی منگوائی اور آرڈر بک پر اشاعتی کام نوٹ کرنے لگا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے حساب کتاب کے بعد ایڈوانس کے طور پر ایک خطیر رقم کا مطالبہ کیا۔

"قائم مقام جنرل مینیجر صاحب" جندوڈے نے میری طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "ادارے کی جانب سے پیشگی رقم عطا کی جائے ـــ"

میں نے حیرت اور برہمی سے اس کی طرف دیکھا۔

"فکر نہ کریں ـــ" میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلکا سا دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ "اپنی آئندہ تنخواہوں میں سے اس رقم کو ایڈجسٹ کر لیں۔ فی الحال پیشگی رقم کا معمہ حل کر دیں۔"

میں نے طوعاً و کرہاً اپنی جمع پونجی جندوڈے کے حوالے کر دی اور باہر آتے ہی پرزور انداز میں احتجاج کیا کہ میرا معاشی استحصال بند کیا جائے۔ میں پہلے ہی حد درجہ مقروض ہوں اور شہر کی متعدد گلیاں مجھ پر بند ہو چکی ہیں۔ نیز قرض خواہوں کا ایک جمِ غفیر میرے تعاقب اور تلاش میں ہے اور کسی بھی وقت مجھ پر کمانڈو ایکشن متوقع ہے۔

"مائی بنفشہ ـــ" جندوڈا میری پیٹھ تھپک کر بولا ـــ "تم پر بے حد مہربان ہو چکی ہے اور اسی کی خواہش پر تمہیں ادارے کا جنرل مینیجر نامزد کیا گیا ہے اب سے تھوڑی دیر پہلے ٹیلی فون پر ہماری دورکنی انتخابی کمیٹی نے تمہاری تقرری کا فیصلہ کیا ہے ـــ"

پھر اس نے میرے بگڑتے ہوئے تیور دیکھ کر مجھے گلے لگاتے ہوئے بتایا ـــ "یہ پروجیکٹ ہمارے لیے ذہنی، قلبی، جذباتی اور مالی آسودگی کے دروازے کھول دے گا۔ بڑے بڑے صنعت کار، جاگیردار، سیاستدان اور فلمی دنیا کے متمول پرندے

ہماری مٹھی میں ہوں گے ۔ سرکار دربار میں رسائی ہو جائے گی ۔ دولت، شہرت اور عزت چھما چھم بارش کی طرح ہم پر برسے گی ۔ ہمارے بینک اکاؤنٹس سوئٹزرلینڈ برطانیہ، بنکاک اور ہالینڈ کے علاوہ سوئٹین میں ہوں گے ۔ غیر ملکی فضائی کمپنیوں کی حسین و جمیل فضائی میزبان خواتین فلائٹ چھوڑ کر ہمارے پاس آ بیٹھا کریں گی ۔ آہ چین کے شہزادے ۔ عظیم دانشور میرے دوست، پروفیسر بی کے بٹالہ، ذرا تصور کی آنکھ سے دیکھو کہ بی او اے سی کے جمبو جیٹ طیارے میں ہم دونوں نیویارک کی طرف پرواز کر رہے ہیں اور فرسٹ کلاس کے کیبن میں ——"

○

دوپہر کو حسب پروگرام جند وڈا مس گل بنفشہ کے پاس لنچ اور دیگر معاملات طے کرنے گیا۔ شام ڈھلے اس کی واپسی ہوئی تو وہ دریائی گھوڑے کی طرح ہانپ رہا تھا اور کانوں کو ہاتھ لگا کر بار بار درد کر رہا تھا۔ اللہ معافی —— اللہ معافی ،

"بات کیا ہے ؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا ۔

"مائی بنفشہ ——" اس نے پھولے ہوئے سانسوں کے ساتھ کہا ——

"ایک خوفناک اور عجیب و غریب جناتی مخلوق ہے ۔ جس نے عوام کو دھوکہ دینے کے لیے انسانی روپ دھار رکھا ہے ۔ وہ مجھ پر ہزار جان سے عاشق ہو چکی ہے ۔ اور ہر فقرے کے بعد نکاح کا مطالبہ کرتی ہے ۔ ایک لاکھ حق مہر کی شرط اس نے بٹا دی ہے اور بغیر کچھ دے کچھ لو کے نکاح کی طالب ہے ۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اپنی ساری جائیداد ادارے سمیت میرے نام وصیت نامے میں لکھنے کے لیے تیار ہے ۔ اف اس کا مسلسل گاجریں چبانا اور سلاد کے پتوں کو کچر کچر کھانا ۔ اور اونچی آواز میں ڈکاریں مارنا اور گولیاں کھانا ۔"

بہرحال ——" وہ اٹھتا ہوا بولا —— "پرسوں شام محجوب پلازہ کے تہخانے میں ادارے کی افتتاحی تقریب منعقد ہو رہی ہے ۔ لیکن اس مرتبہ تم پر ایک اضافی

ذمہ داری عائد ہو چکی ہے ۔ تمہیں دو تقریریں لکھنی ہیں ۔ ایک میرے لیے —— دوسری مائی بنفشہ کے لیے ——"

اس نے جاتے جاتے پُرجوش انداز میں مجھ سے مصافحہ کیا —— "چین کے شہزادے یاد رکھو تصویریں ایسی ہونی چاہئیں کہ حاضرین کی چیں بول جائے اور ان کے اوسان خطا ہو جائیں ۔ علامہ کے اشعار بے تکے میری تقریر میں ڈال دینا ۔ لیکن ۔ لیکن مائی کی تقریر میں آنسہ نسرین صابر و شاکر کے شعروں کا تڑکا لگانا مت بھولنا ۔ سُنا ہے شادی بیاہ کے سلسلے میں اس کی شاعری میرج گائیڈ کا درجہ رکھتی ہے ۔"

اس کے بعد تین چار دن تک جند وڈے نے اپنی شکل نہیں دکھائی ۔ میں مطلوبہ تقریریں تیار کر کے اس کی آمد اور اپنی تقریری کے پروانے کا منتظر رہا ۔ لیکن جند وڈا نہ آیا —— جب میری مایوسی انتہا کو چھونے لگی تو میں نے ایک چھوٹی سی چھڑی لی ۔ اور مس گل بنفشہ کی رہائش گاہ پر پہنچا ۔ اور چھڑی کی نوک سے کال بیل بجائی ۔ اوپری کھڑکی کے پٹ کھلے اور خلافِ توقع مردانہ آواز آئی ۔ "کون ہے ادئے ڈاکٹر ؟"

بلاشبہ یہ جند وڈے کی آواز تھی ۔

اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں ۔ شیو بڑھی ہوئی تھی اور حلیئے سے وہ امیر الدین ٹھگ نظر آ رہا تھا ۔ مجھے دیکھ کر وہ دھڑ دھڑاتا ہوا سیڑھیوں سے اترا اور آتے ہی گلے لگ کر بولا ۔ "چین کے شہزادے —— چوٹ تو نہیں آئی ؟"

"آج اللہ کا کرم رہا ——" میں نے اس کو چھڑی دکھاتے ہوئے کہا —— "حفاظتی سامان میں اپنے ساتھ لے کر آیا ہوں —— تم بتاؤ —— کہاں غائب ہو گئے تھے ۔ لگتا ہے تم نے انسانی بھلائی کے منشور پر دستخط کر دیئے ہیں ۔ نکاح کر لیا ہے ——"

"شش ——" وہ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر بولا —— "مائی چار دن سے

بیمار ہے اور میں اس کی عیادت کر رہا ہوں ۔ ابھی تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر آنے والا ہے۔"

"بیماری کیا ہے؟"

"دل کا عارضہ ——" وہ انگلیوں پر گننے لگا —— "کمر کا درد —— سر کا درد —— جگر کی خرابی —— نظر کی کمزوری —— یادداشت کا بار بار گم ہونا —— اس کے علاوہ ——"

میں نے اس کی بات کاٹ دی —— "ادارے کی بابت کیا سوچا ہے ——"

کہنے لگا —— "پرسوں افتتاحی تقریب کے انتظامات مکمل ہو چکے ہیں ۔ مائی کی بیماری کوئی نئی بات نہیں ۔ جس وقت پہلی جنگ عظیم ہوئی تھی اس وقت سے یہ بیمار چلی آ رہی ہے —— تم تقریریں لائے ہو؟"

اتفاقاً تقریروں کے مسودے میری جیب میں تھے ۔ میں نے نکال کر اس کے حوالے کئے ۔ جندوڈے نے سرسری انداز میں آنکھیں میچ کر کاغذ الٹ پلٹ کئے —— کہنے لگا —— "ٹھیک ہے —— تم جا سکتے ہو —— مگر پرسوں شام پانچ بجے مٹھائی کے ایک خوبصورت بڑے ڈبے کے ساتھ تقریب سے دس پندرہ منٹ پہلے پہنچ جانا ——"

میں نے خفگی سے اس کی طرف دیکھا ۔

وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا —— "چین کے شہزادے ۔ میں تمہاری طنزیہ نظروں کا مطلب سمجھ رہا ہوں —— مگر اس وقت میں خود مہمان ہوں لہٰذا چائے پانی سے تمہاری تواضع نہیں کر سکتا ——"

"مس گل بنفشہ کی عیادت ——" میں نے زور دے کر کہا —— "میرا انسانی اور اخلاقی فریضہ ہے ۔ براہِ کرم سیڑھیوں کا راستہ گھیر کر کھڑے ہونے کی بجائے مجھے کمرۂ علالت تک لے چلو تاکہ میں مس بنفشہ کو جوشاندہ پلینے کا مشورہ دے

سکوں ——"

جندوڈے نے نفی میں گردن ہلا دی ۔ بولا —— "یہ کام پھر کبھی کر لینا ۔ انشاءاللہ آئندہ بھی وہ بیمار پڑے گی —— یہ کوئی آخری چانس نہیں ہے ——"

میں نے نیم دِل کے ساتھ اس سے مصافحہ کیا اور جانے سے پہلے کرنٹ چیک کرنے کے لیے چھڑی کی نوک سے پھر کال بیل بجا دی ——

○

افتتاحی تقریب میں جو ایک ڈراؤنے اور پراسرار نیم تاریک نیم روشن تہہ خانے میں منعقد ہوئی اردگرد کے چند دکانداروں، مناسب رشتے کی متلاشی چند معمّر عورتوں، ہونڈا موٹر سائیکلوں پر سائلنسر نکال کے ہوا خوری کرنے والے چند خوش جمال لڑکوں، تہہ خانے کی بلّیوں، مچھروں، جگمگا دڑوں اور میرے اور جندوڈے کے چند مشترکہ دوستوں، خیر خواہوں اور بدخواہوں وغیرہ نے شرکت کی ۔

میں خالی ہاتھ پانچ بجنے سے بیس منٹ پہلے تقریب میں پہنچا تو ایک بڑی بی دوسری عمر رسیدہ خاتون سے کانا پھوسی کر رہی تھیں ۔

"اے بہن رشیدہ —— کیا بتائیں ۔ ہم لڑکیوں کی تو قسمت ہی خراب ہے ۔ بچپن اس آس میں گذرا کہ شائد ماں باپ خود کہیں ہمارا رشتہ کر دیں ۔ لیکن اللہ نے ——"

دوسری نے انہیں ٹوک دیا —— "خدا کے فضل سے ابھی ساری عمر پڑی ہے ۔ جوانی کا کیا ہے ۔ یہ تو چار دن کی چاندنی ہے ۔ چلی بھی گئی تو ہمارا کیا نقصان ہو جائے گا ——"

پہلی عورت نے کہا —— "رشتوں کے بارے میں ہمیں بھی اپنے مقررہ معیار پر کچھ نظرثانی کرنی پڑے گی ——"

"میں تو نہیں کروں گی ——" دوسری نے چمک کر کہا —— "بیس پچیس سال پہلے میں نے اپنے لیے رشتے کا جو معیار قائم کیا تھا وہ اب تک قائم ہے ۔ آدمی کو اپنی

بات پر اٹل رہنا چاہیے ——"

مجھے کن سوئیاں لیتے دیکھ کر انہوں نے دبی دبی چیخیں مار کر ایک دوسری پر چھلانگ لگا دی۔

جندوڈا اپنے نتھنے پھلائے۔ پگڑی باندھے، سمور کی ایک عجیب خوفناک واسکٹ پہنے ہاتھ میں تقریر لیے لپک لپک کر مہمانوں کا استقبال کر رہا تھا۔ اس کی پگڑی کے اونچے شملے پر گوٹے کناری سے جے ڈبلیو خان کے الفاظ کڑھے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے لپک کر مصافحہ کیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر اس لمبی میز پر لے آیا جو ایک گھٹالوپ گوشتے میں رکھی تھی اور جس پر چند بلیوں کی آنکھیں جگمگا رہی تھی۔ ماچس جلا کر اس نے میز کی وضاحت کی۔ یہ چائے اور اس کے لوازمات کی میز تھی۔ مجھے اس میز کی حفاظت اور پاسبانی کے فرائض سونپ کر وہ تیزی سے لپکتا ہوا ایک بڑے میاں کی طرف بڑھا جو موٹے شیشوں کی عینک لگائے تہہ خانے کے ایک ستون سے مصافحہ کرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"نئی مشینری اور نئے ساز و سامان کے ساتھ کاروبار مبارک ہو محترمہ —— بڑی مشکل سے وقت نکال کر آیا ہوں۔"

یہ الحاج کریم داد چمڑے والے تھے مس گل بنفشہ کے پرانے کرم فرما اور کلائنٹ۔ جندوڈے نے پھرتی سے ان کا رخ اپنی طرف موڑتے ہوئے مصافحہ کیا اور خوشخبری سنائی کہ محترمہ گل بنفشہ بس چند ہی لمحوں بعد پہنچنے والی ہیں۔ ایک بڑے میاں میرے قریب کھڑے کچھ گنگنا رہے تھے۔ یہ کسی نظم کے اشعار تھے اور اس بزرگ کو پڑھنے تھے۔ ان کی پھنسی پھنسی بھنچی بھنچی آواز ماحول کو پُراسرار بنا رہی تھی۔ وہ میری موجودگی سے بے خبر گنگناہٹ کے

ساتھ ساتھ بڑبڑاہٹ سے بھی فیض کام ہو رہے تھے۔ اُوں اُوں۔ تیری نظروں کے چلے تیر میرے سینے پر۔ آں آں۔ سینے پر۔ ہائے بے درد مرے سینے پر۔

ایں ایں۔ ایں آں آں ——"

"میاؤں —— میاؤں بلیوں نے خوش ہو کر آواز میں آواز ملائی۔

"ایں ایں —— آں آں —— ایں ں ں ——"

"میاؤں —— میاؤں —— میاں ں ں —— اوں ——"

"کون ہیں صاحب آپ لوگ ——" ہڑبڑا کر انہوں نے چاروں طرف دیکھا۔

"میاؤں ——" ان کے بالکل قریب سے آواز آئی۔

"بدذوقی کی حد ہو گئی —— "وہ جھلا کر بولے —— "خون جگر سے لکھ کر نظم لایا ہوں اور آپ لوگ ہوٹنگ کر رہے ہیں —— اس طرح تو ادب کبھی ترقی نہیں کر سکتا بھائی صاحبان ——"

"میاؤں —— میاؤں" بلیوں نے احتجاج کیا۔

اتنے میں ہونڈا موٹر سائیکلوں والے نے منہ سے پیں پیں بجانی شروع کی "پھرر رر پھرر رر —— پیں پاں —— پیں پیں —— پاں پاں ——"

اتنے میں لال رنگ کی انتہائی شوخ ساڑھی اور گہرے میک اپ میں ملبوس گل بنفشہ کا ورود ہوا۔ وہ کالے سے ڈرائیور نے نین نقش والی لڑکی پیشوائی کے لیے ساتھ تھی۔ جندوڈے نے فوراً تقریب کے آغاز کا اعلان کر دیا۔ الحاج سیٹھ کریم داد نے تلاوت کی قسم ہے زمانے کی انسان خسارے میں ہے۔ ادھر تلاوت کے بعد انہوں نے اپنی نشست کی طرف بڑھنا شروع کیا ادھر جندوڈے نے انہیں دبوچ لیا۔ بولا —— "جاتے کہاں ہو چین کے شہزادے۔ مس گل بنفشہ کے پرزور اصرار پر آپ کو مہمان خصوصی بننا ہے ——"

سیٹھ صاحب منمنا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ سرگوشی میں پوچھا —— "صدارت کس سے کروا رہے ہو۔ میاں برخوردار ——"

"آپ کے بھائی الحاج سیٹھ حکم داد لوہے سریے والے سے ——" جندوڈے نے سینے پہ ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے کہا۔

ایک بڑے میاں راستہ ٹٹولتے کھنکھارتے، چیخیں مارتے کرسیٔ صدارت کی طرف لپکے۔ یہ الحاج سیٹھ حکم داد لوہے سریے والے تھے۔

دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے سے رسماً ہاتھ ملائے۔ اور ایک دوسرے سے منہ پھیر کر بیٹھ گئے۔ اسٹیج سیکرٹری کے فرائض جندوڈا انجام دے رہا تھا۔ جب اس نے دیکھ لیا کہ صدر اور مہمانِ خصوصی ایک دوسرے کو قطعاً غیر ضروری سمجھ کر اطمینان سے اپنی کرسیوں پہ بیٹھ گئے ہیں تو اس نے پُرجوش انداز میں جے ڈبلیو بندھن سینیٹر کی مالکہ اور خبہ بات کی ملکہ، حسن کی دیوی کو اسٹیج پہ رونق افروز ہونے کے لیے مدعو کیا۔ اس کے بعد شاعر کو بلایا گیا۔ یہ حضرت غافل بدایونی تھے — اس قسم کی محفلوں کی رونق دوبالا کرنے والی چیز۔

ابھی غافل صاحب نے نظم کا پہلا شعر پڑھ کر دوسرے شعر میں آواز کے گل کھلانے اور پھلجھڑیاں چھوڑنے کا —— آغاز کیا ہی تھا کہ عین انترے کے عروج پر جندوڈے نے انہیں ایک طرف دھکیل کر کہا۔

"ذرا ایک منٹ کے لیے اپنی یہ بیٹ میٹ بند کریں جناب۔ ایک ضروری اعلان کرنا ہے۔"

یہ ضروری اعلان مجھ سے متعلق تھا۔

جندوڈا اچنگھاڑتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "عظیم دانشور — پروفیسر بی کے بٹالہ جو ڈویٹی تمہارے ذمے لگائی گئی ہے۔ اس میں غفلت شعاری ہو رہی ہے۔ تم اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر حاضرین میں آ بیٹھے ہو۔ واپس وہیں جاؤ۔ بتیاں سب چیزوں کا بیڑہ غرق کر رہی ہیں — اعلان ختم ہوا — آؤ جی بدایونی صاحب۔ شروع ہو جاؤ۔"

غافل بدایونی نے جھک کر حاضرین کو سلام کیا اور روہانسی آواز میں دوبارہ نظم شروع کی۔ جندوڈا اس عرصے میں دانت کچکچاتا، کلبلاتا اور پہلو بدلتا رہا۔ شاعر جب نظم کے آخری شعر پر پہنچ کر اسے مکرر ارشاد کرنے لگا۔ تو جندوڈے سے نہ رہا گیا۔ وہ لپک کر اٹھا اور ایک جھٹکے سے غافل کو پیر سے دھکیلتے ہوئے بولا۔ "بس جی آپ کا کام ختم ہوا۔ تشریف لے جائیں — ہاں تو خواتین و حضرات —— اب آپ دِل جگر تھام کے بیٹھیں میری باری آئی۔"

جب بار بار اس نے لمبے وقفے دینے شروع کیے اور آوازیں دے دے کر میری کمک لینی شروع کی تو حاضرین کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ لوگ پہلو بدلنے کھنکھارنے اور باتیں کرنے لگے۔

"مجھے معلوم ہے چین کے شہزادو ——" جندوڈے نے کاغذ تہہ کر کے جیب میں رکھتے ہوئے اچانک اپنی آواز بلند کر دی۔ "مجھے معلوم ہے کہ آپ کیا باتیں کر رہے ہیں۔ آپ بحالیٔ جمہوریت کے سلسلے میں پریشان ہیں۔ پوری قوم کی یہی سوچ ہے۔ میں بھی صبح سے یہی سوچ رہا ہوں کہ بحالیٔ جمہوریت کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اسی لیے آپ کو مدعو کیا ہے ——"

لوگوں نے یک دم اس طرف کان لگا دیئے۔ حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔

میں نیم تاریکی میں رینگتا ہوا اسٹیج کی طرف بڑھا۔ اکڑوں بیٹھ کر میں نے جندوڈے کی پنڈلی پر چٹکی لی۔

جندوڈا اچھل پڑا۔ دھاڑ کر بولا —— "جب ہم جمہوریت کی بات کرتے ہیں تو مخالف ہماری چوندڑیاں کاٹتے ہیں۔ یہ لوگ جمہوریت کی قدر و قیمت نہیں پہچانتے بڑے افسوس کی بات ہے کہ مجھ پر خفیہ حملہ کر دیا گیا ہے بہرحال اس حملے کو جاری رہنے دیں۔ میں اپنی بات پوری کروں گا ——"

"کون ہے ——" ایک بڑی بی نے سہم کر چیخ ماری —— "میری وگ پکڑ کے کس نے کھینچی ہے؟" "کون ہے سامراجی ایجنٹ ——" جندوڈا چنگھاڑتا خم ٹھونکتے ہوئے بولا —— "باز آجاؤ اپنے سامراجی ہتھکنڈوں سے خبردار۔ نہتی عورتوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہ کرنا۔ یہ تمہاری ماں اور نانی کے برابر ہیں۔"

جندوڈے کا اتنا کہنا غضب ہوگیا۔ بڑی بوڑھیاں دھاڑتی چنگھاڑتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ہر طرف سے جندوڈے پر لعن طعن ہونے لگی۔ ایک بڑی بی تو اس قدر جوش میں آئیں کہ انہوں نے اسٹیج پر جوتی کھینچ ماری۔ جو عین نشانے پر لگی یعنی سیٹھ کریم داد چھڑے والے بھنّا گئے۔ اور دھڑام سے کرسی سمیت فرش پر الٹ گئے۔

کسی جوشیلے نوجوان نے بھرپور کارکردگی دکھانے کے لیے مین سوئچ آف کر دیا۔ ہر طرف پھر رر پھر رر میاؤں میاؤں، ہائے ہائے، پرے گونجنے لگی۔ چند خائف حاضرین نے گھٹا گھٹ لائیٹر اور ماچسیں جلائیں جنہیں نسبتاً کم خائف ناظرین نے پھونکیں مار کر بجھا دیا۔

"ہائے میری وگ ——" ایک چیختی ہوئی آواز آئی۔

"اف میری بتیسی ——" ایک پوپلی آواز لہرائی۔

"آہ —— میری عینک ——" ایک ڈگمگاتی ہوئی آواز لڑکھڑائی۔

پھر کرسیاں گھومنے اور پلیٹیں چلنے لگیں۔ میزیں الٹنے اور ماچسیں جلنے لگیں۔ کسی نے دانت کچکچا کر ایک مکہ میری پسلی میں رسید کیا۔ جواباً میں نے دونوں ہاتھوں سے حملہ آور کو پرے دھکیلا۔ اور مکہ مارنے سے پہلے اس کا سر ٹٹولا۔ میرے ہاتھ میں جندوڈے کا شملہ آیا۔ میں نے اسی پر اکتفا کی اور پھرتی سے پگڑی اُتار کر سیڑھیوں کی طرف چھلانگ لگا دی۔ اوپر سے کوئی نیچے آرہا تھا۔ ہم دونوں دھپ سے گرے۔

"مار دیا ظالم ——" گرنے والے نے اٹھنے کی کوشش میں پھر گرتے اور مجھے گراتے ہوئے کہا۔

"مار دیا۔ شہر بُلا کے ظالموں نے مار دیا ——"

میں چونک پڑا۔ یہ آواز تو خاصی جانی پہچانی تھی۔ میں نے جلدی سے سنبھل کر اٹھتے ہوئے اسے اٹھایا —— "چوٹ تو نہیں آئی چچا جان ——"

"اتنی خاص نہیں ——" گرنے والے نے کہا —— "غالباً دو چار پسلیوں پر زد پڑی ہے۔ تم پروفیسر بٹالہ تو نہیں؟"

"بے شک ——" میں نے گرمجوشی سے مصافحہ کیا —— "اور آپ کو تو میں آواز ہی سے پہچان گیا ہوں۔ چچا نصیر الدین عرف کالی بدریا ——"

"تمہارے منہ میں گھی شکر ——" نصیر الدین نے کہا —— "باہر نکلیں یا نیچے چلیں۔"

میں نے کہا —— "نیچے تو اب ٹوٹی ہوئی پلیٹوں کے علاوہ آپ کو کچھ نہیں ملے گا۔ باہر ہی چلتے ہیں۔"

ہم دونوں آہستہ آہستہ کراہتے اور اپنے سروں اور جسموں کو سہلاتے اوپر آئے۔ اوپر کھلی ہوا میں آتے ہی چچا نصیر الدین کے اوسان بحال ہو گئے پھر مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔

"بہت بہت مبارک ہو ——"

"خیر مبارک ——" میں نے حیرت سے کہا۔ "کس بات کی مبارک؟"

"شادی دفتر کھولنے کی ——" چچا نصیر باچھیں پھیلا کر بولا —— "جندوڈے برخوردار نے مجھے خط لکھ کر اس دعوت میں بلایا تھا۔ اور وعدہ کیا تھا کہ جیسے ہی میں یہاں پہنچوں گا۔ فوراً میرا کام ہو جائے گا ——"

"کام ——؟" میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا "کام تو ابھی ہم نے شروع نہیں ——"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے ——" چچا نصیر نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔

"برخوردار نے میرے لیے رشتہ پہلے سے ڈھونڈ رکھا ہے ——"

"پکا پکا پکّا؟" چچا نصیر پرجوش انداز میں بولا —— "جذبات کی ملکہ۔ پریوں کی رانی۔

مدھو بالا ثانی ــــ مس گل بنفشہ بی اے لافانی ــــ جندوڈے نے اس کی تصویر بھی مجھے بھیجی تھی اور اس کے ہوش ربا حُسن کی تفصیلات بھی مجھے لکھیں تھیں۔ یہ بھی لکھا تھا کہ بات پکّی ہو چکی ہے۔ مَیں آج پہنچ جاؤں، تاکہ تقریب کے فوراً بعد میرا نکاح اس بی بی کے ساتھ باندھ دیا جائے، صَد ہزار آفرین ہے برخوردارم جندوڈے اور آپ کی مشترکہ کدو کاوش، تلاش و جستجو پر۔"

چچا نصیر الدّین کی تحویل میں نقد رقم کے علاوہ ایک زنانہ انگوٹھی، ایک مردانہ تلے والی جُوتی، ایک حد درجہ شوخ رنگ کا مردانہ کُرتہ لاچہ اور پگڑی تھی۔ یہ یقیناً ہونے والی شادی کا ساز و سامان تھا۔

اور پھر حیران کن انداز میں دونوں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ نکاح کے چھوہارے اور لڈو کھاتے ہُوئے مَیں سوالیہ انداز میں جندوڈے کی طرف دیکھتا رہا۔ جو مس گل بنفشہ بی اے کے چرنوں میں جھُکا ہُوا کہہ رہا تھا۔

"بچی جان! سُسرال جاتے ہی چچا جان کا بکرا میری طرف چلتا کروائیں۔ اس بکرے کی بھُنی ہُوئی ران نوش کر کے مَیں تا عُمر آپ کو دُعائیں دوں گا۔"

اس سے بھی حیران کُن عمل یہ ہُوا کہ جندوڈے کی عاجزانہ درخواست پر بڑی بی نے ناک بھوں چڑھاتے کی بجائے اٹھلا کر کہا: "چل ہٹ۔ شریر کہیں کا!"

مصنّف کا نوٹ:

ناچیز مصنّف کا جی تو چاہتا تھا کہ وُہ آپ کی معلومات اور دلجمعی کی خاطر نکاح کی جُملہ تفصیلات اور جزئیات بھرپُور انداز میں تحریر کرے لیکن خُدا کے علاوہ سنسر کی مجبوریاں بھی دامن گیر ہیں لہٰذا تھوڑا لکھے کو بہت جانیئے اور جہاں جہاں کہانی نے اچانک زقند لگائی ہے وہاں اپنے تخیّل کو پرواز کی زحمت دیجیئے۔ نتیجہ خاطر خواہ برآمد ہو گا۔

فکاہیے

لاؤ کتنے چاہئیں؟

ہمارے ایک عزیز ہیں۔ ان کا تکیۂ کلام ہے۔ "لاؤ کتنے چاہئیں"؟ بات کسی موضوع پر ہو رہی ہو، مسئلہ کیسا ہی کیوں نہ ہو وہ چٹکی بجا کر فوراً بیچ میں کود پڑیں گے۔ "لاؤ کتنے چاہئیں"۔ خالص گھی کی نادستیابی کا مسئلہ ہو یا سستے مگر اچھے آموں کی کمیابی کا معاملہ۔ وہ فوراً چٹکی بجا دیں گے۔ "لاؤ کتنے چاہئیں"۔

کل ہمارے ایک دوست کے والد فوت ہو گئے۔ بس ہم سے یہ غلطی ہوئی کہ ان

بس ہم سے یہ غلطی ہوئی کہ ان عزیز کو بھی تعزیت کے لیے اپنے ساتھ لے گئے دوست غم سے نڈھال تھا۔ رو رو کر غریب کی آنکھیں سوج گئی تھیں، بال بکھرائے شیو بڑھائے وہ ہمارے گلے سے لگ کر پہلے تو خوب رویا۔ ہم نے اس کے آنسو پونچھے۔ تسلی دی۔ خدا کی رضا پر شاکر ہونے کی تلقین کی۔ "صبر کرو بھائی۔ خدا کی مرضی کے آگے انسان بے بس ہے۔ ہر ذی روح کا ایک وقتِ رخصت مقرر ہے نہ ایک سیکنڈ آگے نہ ایک سیکنڈ پیچھے۔ اللہ بخشے مرحوم بہت نیک، متقی اور پرہیزگار تھے۔ انتہائی شفیق اور مہربان بزرگ تھے۔ ایسا باپ تو خوش نصیب اولاد ہی کو ملتا ہے"

ہمارے اس عزیز نے فوراً چٹکی بجائی۔ بولے "لاؤ کتنے چاہئیں؟"

دوست سے تو خیر ہمارا قطع تعلق ہو گیا۔ لیکن عزیز محترم سے تعلقات بدستور ہیں

کچھ تو عزیزداری کا لحاظ، کچھ ان کی ناراضگی کا خوف۔ کچھ اپنی حد سے بڑھی ہوئی مروّت کی مجبوری۔ بس یہ سب چیزیں مل جل کر ہمارے اور ان کے درمیان میل ملاپ کی وجوہات خاص ہیں۔

عمر تو ان کی پچاس کے لگ بھگ ہے۔ لیکن اب تک وہ اپنی ڈیٹ آف برتھ کے سلسلے میں مطمئن نہیں۔ گاہے بگاہے دیر تک یقین دلاتے رہتے ہیں کہ ان کے ابّا مرحوم سے تاریخ پیدائش لکھواتے وقت دانستہ غلطی ہوئی۔ ایک بار ہم نے انہیں ٹوکنے کی جسارت کر لی۔ کہا۔ "آپ نے بعد میں تاریخ پیدائش درست کیوں نہ کروالی؟"

بولے "کچھ قانونی پیچیدگیاں تھیں"

ہم نے پوچھا "مثلاً کون کون سی؟"

کہنے لگے "یہ کیا سوال پوچھ لیا میاں آپ نے۔ قانونی پیچیدگیاں پیدا ہوتے دیر لگتی ہے۔ لاؤ کتنی چاہئیں۔"

ایک دن بچّے اور اچھے دوستوں کے فقدان پر بات ہو رہی تھی۔ ہمارے بزرگ بار بار اپنا ٹریڈ مارک بول رہے تھے۔ "لاؤ کتنے چاہئیں؟"

"تنگ آ کر ہم نے کہا۔ "آپ لا کر دکھائیے، اگر پسند آیا تو دوسرے کا آرڈر دیں گے۔"

ہماری کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ جہاں معاملہ نازک ہو یا مسئلہ گھمبیر ہو انہیں دخل در معقولات سے روکا جائے۔ قریب نہ پھٹکنے دیا جائے۔ دور ہی دور سے ٹال دیا جائے۔ مگر وہ ٹلنے والی اسامی نہیں۔ ایسے موقعوں پر بڑی مسکین سی صورت بنا کر بیٹھ جائیں گے۔ تاثر یہی دیں گے کہ انہیں زیرِ غور مسئلے سے کوئی تعلق کوئی واسطہ نہیں، محض آبزرور کی حیثیت سے ہمارے

درمیان تشریف فرما ہیں۔ لیکن جیسے ہی گفتگو کے دوران کوئی وقفہ یا مناسب موقع آئے گا فوراً چٹکی بجا کر میدان میں کود پڑیں گے۔

ان کے چٹکی بجانے کا انداز یہ ہے کہ سیدھے ہاتھ کو ڈنڈے کی طرح اکڑا کر اپنے سر سے بلند کر لیتے ہیں یا سنگین چڑھی رائفل کی طرح مخاطب کے سامنے کر دیتے ہیں۔ نیا آدمی ہو تو پریشان ہو کر سیدھے نشانے کی زد سے بچنے کی کوشش کرتا ہے، یا بوکھلا کر کہہ بیٹھتا ہے

"طبیعت تو ٹھیک ہے ناں آپ کی۔"

وہ اپنی رَو میں رہتے ہیں، کبھی کسی مخاطب کی بات کا متعلقہ جواب نہیں دیتے۔ ہر چند لوگ ان سے بدکتے ہیں، مگر ان کے سفید بالوں کی وجہ سے ان کے سامنے چُپ سادھ لیتے ہیں، مگر پچھلے دنوں ان کے سفید بال دفاعی حصار قائم نہ رکھ سکے۔ عزیزوں میں اچھی خاصی جنگ چھڑ گئی۔

ایک نوجوان عزیزہ کے شوہر ہوائی حادثے میں ہلاک ہوئے۔ قریبی رشتہ داری کے پیشِ نظر ہم سب کام چھوڑ کر تعزیت کے لیے پہنچے۔ وہاں سارا خاندان جمع تھا۔ بیوہ کو تسلّیاں دی جا رہی تھیں، نظر اُٹھائی تو کیا دیکھتے ہیں کہ آپ بھی اس ہجوم میں موجود ہیں۔ اور اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں۔

ایک بزرگ خاتون نے بیوہ کا سر اپنی گود میں لے رکھا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے ان کی پیٹھ تھپک رہی تھیں۔ "نہ رو میری بیٹی۔ نہ رو میری بچّی۔ ہونی کو کون روک سکتا ہے اچھا بھلا خوش و خرم سفر پر روانہ ہوا تھا، کیا خبر تھی کہ قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ کیسا پیارا جوان تھا۔ کتنے اچھے اخلاق والا تھا۔ کیسی ادب تمیز سے باتیں کرتا تھا۔ ہائے تیرے

نصیب اُجڑ گئے۔ ایسا راج دُلارا اتنا پیارا شوہر کسے ملتا ہے۔"

ہمارے عزیز محترم نے ہاتھ ڈنڈے کی طرح سر سے بلند کیا۔ چٹکی بجا کر بولے۔

"دولاڈ، کتنے چاہئیں؟"



ہیں کواکب کچھ.....

عبدالغفور پروانہ چک نمبر تین سو چالیس (گ ب) سے بذریعہ بس لاہور کے لیے روانہ ہُوا۔ جب لاہور پہنچا تو شام کے پانچ بج رہے تھے۔ فضا میں خاصا گرد و غبار اور دم گھونٹ دینے والا حبس تھا۔ ایک حجام کی دکان پر عبدالغفور پروانہ نے اپنا ادھڑا ہُوا سفری تھیلا رکھوایا اور تین روپے دے کر غسل کیا اور ادیبوں سے ملنے کی مہم پر چل کھڑا ہُوا۔ سب سے پہلے اس نے جناب احمد ندیم قاسمی کے رسالہ فنون کے دفتر میں حاضری دی اور نہایت تپاک اور عقیدت سے ہاتھ ملا کر چُپ بیٹھ گیا۔ آدھ گھنٹہ چُپ بیٹھنے کے بعد وُہ کسمسا کر اُٹھا اور باہر نکل کر قتیل شفائی صاحب کی تلاش میں روانہ ہوگیا۔ مختلف ویگنیں اور بسیں بدلنے کے بعد جب وُہ ان کے دولت کدے پر پہنچا تو معلوم ہُوا کہ قتیل صاحب شہر سے باہر کسی شہر سے مشاعرے میں گئے ہُوئے ہیں۔ سخت بدمزہ ہو کر وُہ پھر ویگنیں اور بسیں بدلتا ہُوا ظہیر کاشمیری صاحب کے پاس پہنچا۔ وُہ اپنے کام میں اس قدر مصروف تھے کہ اس کا نام اور آمد کا مقصد تک نہ پُوچھ سکے۔ وہاں سے دل برداشتہ ہو کر وہ منیر نیازی صاحب کے گھر پہنچا جاتے ہی بڑی گرمجوشی سے ان سے مصافحہ اور معانقہ کیا اور ان کے رُوبرو زانوئے ادب تہہ کر کے بیٹھ گیا۔ جب خاصی دیر ہوگئی اور کوئی بات نہ ہوئی تو نیازی صاحب نے اس سے رُخصتی مصافحہ کر کے اُٹھتے ہُوئے کہا۔ "اچھا پھر ملیں گے"۔ وہاں سے آزردہ خاطر ہو کر عبدالغفور پروانہ

پاک ٹی ہاؤس پہنچا۔ معلوم ہُوا اوپری منزل پر ایک ادبی اجلاس ہو رہا ہے۔ عبدالغفور پروانہ اُوپر پہنچ کر دُبک اور سہم کر سامعین میں بیٹھ گیا۔ اجلاس ڈھائی گھنٹے تک جاری رہا اس دوران عبدالغفور ایک ایک کا مُنہ تکتا رہا اور سوچتا رہا کہ فلاں فلاں صاحب کو کہاں دیکھا ہے۔ بعد میں اس نے بڑی گرم جوشی اور اپنائیت کے ساتھ سب سے ہاتھ ملایا۔ بعضوں کے گلے لگا اور خاموشی سے باہر نکل آیا۔ کسی ادیب یا شاعر نے اس بات کی ضرورت نہیں سمجھی کہ اس کا نام پُوچھا جائے۔ یا اس سے تعارف حاصل کیا جائے۔ البتہ وہ اکثر ادیبوں شاعروں اور دانشوروں کے نام اور پتے نوٹ کرتا رہا۔ ٹی ہاؤس سے نکل کر وُہ حجام کی دکان پر پہنچا، جہاں اپنا بیگ رکھوا گیا تھا، چونکہ حجام اسی دکان میں سوتا بھی تھا۔ اس لیے عبدالغفور پروانہ کے لیے بھی رات بسر کرنے کی گنجائش اور سہولت پیدا ہوگئی۔ چند ہی لمحوں میں وُہ محمد شریف باریر کا دوست بن گیا۔ صبح اُٹھ کر اس نے لاہور کے چند کام نمٹائے اور دوپہر کو چک نمبر تین سو چالیس (گ ب) کی بس میں سوار ہوگیا۔ گاؤں پہنچ کر اس نے اپنا سفر نامہ تحریر کیا جو کچھ اس طرح ہے :۔

جب میں لاہور پہنچا تو ٹھنڈی اور معطر ہواؤں نے لہرا کر میرا استقبال کیا۔ اس وقت شام پانچ بجے تھے۔ قاسمی صاحب کو فون کر کے اپنی آمد کی اطلاع دی تو انہوں نے فوراً اپنی گاڑی اور ڈرائیور بھیج کر مجھے بُلوا لیا۔ رات کا کھانا قاسمی صاحب کے گھر پر ہی کھایا۔ وُہ دروازے تک مجھے چھوڑنے آئے اور اپنا ڈرائیور اور گاڑی میرے حوالے کر کے دیر تک نم آلود آنکھوں سے مجھے رخصت ہوتا دیکھتے رہے اور ہاتھ لہراتے اور رومال سے آنکھیں پونچھتے رہے۔ ڈرائیور نہایت مؤدب اور تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ ایک اندازے کے مطابق اس کی تعلیم ایم اے کے قریب قریب رہی ہوگی۔ اس نے مجھے قتیل شفائی صاحب کے گھر پہنچایا۔ قتیل صاحب کو میری آمد کی اطلاع مل چکی تھی، وُہ کھانا چھوڑ کے ننگے پاؤں بھاگتے

ہُوئے آئے اور مجھے بے تہاشا گلے لگا کر گھسیٹتے ہُوئے اندر لے گئے۔ ان کے بے حد اصرار پر ان کے ساتھ بھی کھانا پڑا۔ ہم کھانا کھا ہی رہے تھے کہ منیر نیازی کا فون آگیا۔ کسی نے انہیں میری آمد کی اطلاع دے دی تھی۔ وُہ مجھ سے ملنے کے لیے سخت مضطرب اور بے چین تھے لیکن قتیل صاحب کا اصرار تھا کہ مَیں کھانے کے بعد آرام کروں، خیر، میں کسی طرح قتیل صاحب کی آنکھ بچا کر نکل آیا۔ ڈرائیور کو منیر نیازی صاحب کے گھر کا پتہ سمجھایا، ہم وہاں پہنچے تو نیازی صاحب ننگے پاؤں، ننگے سر، پریشان پریشان لان میں ٹہل رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی جھپٹ کر گلے لگا لیا اور فوراً کھانا لگوا دیا، مَیں لاکھ انکار کرتا رہا، لیکن نیازی صاحب نے میری ایک نہ مانی۔ ان کے پُرخلوص جذبات کی قدر کرتے ہُوئے مَیں ہاتھ دھو کر ان کے ساتھ بھی کھانے کے لئے بیٹھ گیا۔ کھانے کے بعد قہوے کا دَور چلا اور دیر تک میری ادبی کامیابیوں کے تذکرے ہوتے رہے۔ چونکہ پاک ٹی ہاؤس کے ایک اجلاس کی مجھے صدارت کرنی تھی، لہٰذا قہوے کا دَور ادھورا چھوڑ کر مَیں اُٹھ کھڑا ہُوا۔ ٹی ہاؤس پہنچا۔ تو جلسہ شروع ہو چکا تھا لیکن سب کو میرا انتظار تھا۔ میرے پہنچتے ہی کھلبلی سی مچ گئی، سارے ادیب و شاعر مجھے دیکھ کر ہڑبڑا کر اپنی اپنی نشستوں سے اُٹھ کھڑے ہُوئے، ہر شخص کی خواہش تھی کہ سب سے پہلے وُہ مجھ سے مصافحہ یا معانقہ کرے، بہرحال اس مرحلے سے فارغ ہو کر مَیں نے اجلاس کی کارروائی دوبارہ شروع کروائی، اجلاس کے اختتام پر تو میری یہ حالت بنا دی گئی، گویا مَیں گڑھ ہوں اور سامعین مکھیاں۔ یا پھر مَیں شمع ہوں اور حاضرین پروانے، جسے دیکھئے میرا پتہ نوٹ کر رہا ہے، میری طرف آٹو گراف بڑھا رہا ہے، کئی تنظیموں کے سرپرستوں نے ہاتھ تک جوڑے کہ للہ دو چار دن ٹھہر جائیں، آپ کے اعزاز میں ایک اعلیٰ درجے کی تقریب منعقد کرتے ہیں، لیکن مَیں مُسکرا مُسکرا کر ٹالتا رہا، رات گئے مَیں اپنے ہوٹل پہنچا، تو ریسپشن پر کئی پیغامات میرے منتظر تھے۔ ایک پیغام صوبائی حکومت کے نمائندے کی طرف سے

تھا" میلہ مویشیاں عنقریب منعقد ہونے والا ہے۔ دو چار دن اور ٹھہر جائیے، تاکہ بھاگ ناڑی بیلوں کے شائقین آپ کو بھی دیکھ لیں۔"

ایک پیغام حسن رضوی کا تھا کہ ابھی ابھی انٹرنیشنل مشاعروں سے فارغ ہو کر آیا ہوں، آتے ہی آپ کی آمد کی اطلاع ملی۔ دس گیارہ مرتبہ فون کر چکا ہوں، لیکن آپ کی آواز کی شیرینی میرے حصے میں نہیں آئی۔ براہِ کرم صبح تیار رہیں۔ میں منہ اندھیرے پہنچ کر آپ کا انٹرویو کروں گا، ساتھ فوٹو گرافر بھی ہوں گے، جو آپ کی رنگین اور دیدہ زیب تصویریں بنائیں گے۔ للہ دسال میں ایک آدھ چکر غیر ممالک کا بھی لگا لیا کریں، وہاں آپ کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ بی بی سی کا نمائندہ بھی سب سے پہلے آپ ہی کی خیریت پوچھتا ہے۔"

خیر میں نے حسن رضوی کو فون کر کے ٹال دیا کہ برادرم میں تو گیارہ بجے دن سے پہلے سو کر نہیں اٹھتا، آپ منہ اندھیرے آ کر کیا کریں گے، لیکن ادبی اخباری نمائندوں نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا، ہر شخص کی خواہش تھی کہ میں اس کے اخبار کے ادبی ایڈیشن کے لیے انٹرویو دوں، اور بتاؤں کہ ادب کی صورتِ حال کیا ہے اور اس حالت میں ادیب کا کیا فرض بنتا ہے، پروفیسر سعادت سعید، عطاالحق قاسمی اور امجد اسلام امجد کے بھی فون اور پیغامات موصول ہوئے کہ خدا کے لیے ملاقات کی کوئی سبیل نکالیں، اور ہم سے ادب پر بات کر کے ہمیں ذہنی الجھنوں، پریشانیوں اور قلبی وسوسوں سے نجات دلائیں، لیکن مجھے خطرہ تھا کہ جہاں ادب کے موضوع پر لب کشائی کروں گا، ادبی دنیا میں کوئی نہ کوئی فتنہ اٹھ کھڑا ہو گا اور سارا ملبہ مجھ پر آ گرے گا۔ لہٰذا میں ہنس ہنس کر سب کی التجائیں اور درخواستیں رد کرتا رہا، کیونکہ فسادِ خلق سے میں ہمیشہ اجتناب کرتا ہوں، اور نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے باہم سر پھٹول ہو یا آپس میں خشت باری شروع ہو جائے۔ یہ ٹھیک ہے کہ لوگ علامہ اقبال، حفیظ جالندھری، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی کے

ساتھ ہی مجھ ناچیز کا نام بھی لیتے ہیں اور عمر کے لحاظ سے میری مقبولیت کو بیسویں صدی کا معجزہ قرار دیتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں خود شہرت سے بہت دور بھاگتا ہوں، اور حتی المقدور کوشش یہی ہوتی ہے کہ گوشۂ گمنامی میں خاموشی سے بیٹھ کے خدمتِ ادب میں زندگی گذار دوں، لیکن لوگ پیچھا نہیں چھوڑتے۔ کسی نہ کسی تقریب کی صدارت کے لیے اخلاقی دباؤ ڈال کے مجبور کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے ماہنامہ "اونٹ" کی کوئی کل میں اب تک سیدھی نہیں کر پایا اور ہمیشہ تاریخ مقررہ گذر جانے کے بعد ہی اس کی ڈمی تیار کر کے پریس لانہ برانچ کو بھجواتا ہوں، تاکہ ڈکلریشن منسوخ نہ ہو جائے، اور میں اپنے نام کے ساتھ مدیر اعلیٰ ماہنامہ "اونٹ"، لکھنے سے بھی جاؤں!

ایک افریقی دوست کے نام

مائی ڈیئر وکٹر لمباسہ دنداسہ!

اُمید ہے تم اپنے ملک پہنچ کر حسبِ سابق پٹرول پمپ پر ملازمت کر رہے ہو گے، اور گرد و غبار میں اٹی ہوئی گاڑیوں میں پٹرول بھرنے کا پرانا فریضہ مستعدی سے انجام دے رہے ہو گے۔ شاید تمہیں افریقہ کے اس دُور افتادہ علاقے کے پٹرول پمپ پر یا اپنے کمرے میں جاکر کبھی یاد نہ آئے کہ کبھی ہم بھی تم تھے آشنا۔ مجھے یاد ہے سب ذرا ذرا۔ تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو، ایسا لگتا ہے کہ جیسے ابھی کل ہی کی بات ہو کہ تم مال پر ایک ریڑھی والے سے چڑیا گھر کا پتہ پُوچھ رہے تھے اور وُہ ہکا بکا تمہارا مُنہ تک رہا تھا اور غالباً دل ہی دل میں کہہ رہا تھا یا الٰہی! بھیج کوئی ترجمان۔ جو اس افریقی سے چھڑائے جان۔ کہ اللہ نے اس کی سُن لی اور مَیں وہاں پہنچ گیا۔ تم نے ایکسکیوزمی کہہ کر حرفِ مدعا بیان کیا۔ سچ یہ ہے کہ تمہاری جناتی شکل دیکھ کر ایک دفعہ تو میرا جی چاہا کہ گونگا بن جاؤں اور آں اوں کرتا ہُوا آگے نکل جاؤں۔ لیکن ایک تو تم غیر ملکی تھے پھر میرے ملک میں تھے اور پھر میرے شہر میں تھے۔ لہٰذا میں نے تمہیں پتہ سمجھانا اپنا فرض سمجھا۔ کیونکہ مَیں ایک ذمہ داری شہری ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ جو خوشی گوری میموں کو پتہ سمجھاتے ہُوئے حاصل ہوتی ہے وہ پسینے میں شرابور ایک افریقی سے قطعاً حاصل نہیں ہُوئی۔ البتہ میں نے تم سے پُوچھ ضرور لیا "آخر تم چڑیا گھر ہی کیوں جانا چاہتے ہو۔ میرے شہر میں تو دیکھنے کی اور بھی بہت سی جگہیں

اور چیزیں ہیں۔"

"مثلاً۔؟" تم نے بھویں اچکا کر انگریزوں کے انداز میں پُوچھا۔

"مثلاً بھیجے کے پائے، بھاٹی کی حلیم، لکشمی کا ہانڈی گوشت، لاہور کے تانگے۔ قدیم عمارتیں اور ان کی خستہ حالی۔ دیواروں پر عاملوں کاملوں کے نجومیوں اور کھوئی ہُوئی طاقت بحال کروانے کی خوشخبریاں۔ الغرض:

کہاں تک سُنو گے کہاں تک سُناؤں ÷ ہزاروں جگہیں ہیں میں کیا کیا بتاؤں

تم نے فوری طور پر فرمائش کی کہ بندر، لنگور، ریچھ اور طوطے چڑیاں تو تم بعد میں دیکھ لوگے سب سے پہلے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس اور اچھی سی چائے پینا چاہتے ہو۔"

اگر تمہاری جگہ کوئی یورپین بنجارن یا بات کرتی تو مَیں خدمتِ خلق کے جذبے سے سرشار ہو کر سیدھا اسے شیزان، فلیٹیز یا پرل کان لے جاتا۔ لیکن تمہارے لیے ٹی ہاؤس بھی مجھے مہنگا لگا۔ لیکن مہمان نوازی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ چنانچہ مَیں تمہیں ٹی ہاؤس لے گیا۔ وہاں اس روز کوئی تنقیدی اجلاس تھا، لہٰذا معمول سے زیادہ گہما گہمی نظر آ رہی تھی۔ تم نے اس بھیڑ بھاڑ اور دھواں دھار فضا میں داخل ہونے میں ہچکچاہٹ محسوس کی۔

مَیں نے تم پر واضح کر دیا کہ یہ کوئی پب یا بار یا کیفے نہیں ہے۔ شہر کے دانشوروں کے اکٹھا ہونے کی مرکزی جگہ ہے۔ اور یہاں دانشورانہ رموز و نکات کے علاوہ چائے وغیرہ بھی مل جاتی ہے۔ البتہ چونکہ میری جان پہچان کے سبھی لوگ دانشور لوگ ہیں، لہٰذا وہ میرے ہمراہ پٹرول پمپ پر کام کرنے والے ایک عام افریقی سیاح کو اس وقت تک درخورِ اعتنا نہیں سمجھیں گے، تاوقتیکہ انہیں یقین نہ ہو جائے کہ نو وارد اجنبی مہمان بھی دانشور ہے۔ لہٰذا اندر داخل ہونے سے پہلے پسینہ پونچھو، ہوش و حواس میں آؤ۔ اور خود کو فی الفور دانشور سمجھو۔"

تم نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں اور بھاگنے کا انداز اپنانا چاہا۔ لیکن شیشے کے پار

اندر بیٹھے ہوئے احباب ہمیں دیکھ چکے تھے اور اب تمہارا بھاگ نکلنا میرے لیے پریشان کن سوالات کی بوچھاڑ کا باعث بن سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے تمہارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور تم پر تمہاری زندگی کا سب سے حیران کن انکشاف کیا۔ "تم افریقی جدوجہد آزادی کے سرگرم کارکن ہو اور تمہاری نظموں کا مجموعہ دنیا کی سات زبانوں میں چھپ چکا ہے۔"

اس انکشاف پر تم نے ایک جھٹکے سے (افریقی جھٹکے سے) اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور "اوہ گاڈ۔ مائی گاڈ" کرتے ہوئے بھاگے۔ میں نے لپک کر دوستانہ انداز میں تمہارا راستہ روک لیا۔ اور تم سے لجاجت آمیز لہجے میں کہا۔ "مائی ڈیئر وکٹر لمباسہ۔ اب تم وکٹر لمباسہ نہیں رہے میں نے تمہارے ساتھ ایک تخلص لگا دیا ہے۔ اب تم وکٹر لمباسہ دنداسہ ہو۔ اس پروموشن پر مبارک باد قبول کرو۔ اور اندر چل کر میرے شہر کے دانشوروں سے ملو۔ تمہاری روح خوش ہو جائے گی اور چائے کی ایک نہیں کئی پیالیاں تمہاری نذر کی جائیں گی۔ اگر کچن میں شامی کباب یا چانپیں تیار ہو چکی ہوں گی تو وہ بھی بونس کے طور پر تمہاری لذتِ کام و دہن میں اضافہ کریں گی۔"

چانپوں اور کبابوں کا ذکر سن کر تمہارے چہرے سے حیرت گئی اور مسرت آئی۔

بالآخر مائی ڈیئر۔ تم میرے ساتھ بطور افریقی شاعر اور دانشور اندر جانے پر بخوشی تیار ہو گئے۔ البتہ تم نے اندر قدم رکھنے سے پہلے میرے کان میں کہا۔ "چانپ اور کباب ــــ انڈر سٹینڈڈ۔؟"

اندر پہنچ کر جب میں نے تمہیں دانشوروں سے ملایا تو ارد گرد کی تمام میزوں پر بحث میں مصروف لوگ بھی ہماری میز کے گرد اپنی کرسیاں کھینچ لائے۔ اس سے پہلے کہ تم اس بھیڑ سے گھبرا کر راہِ فرار اختیار کرتے میں نے فوراً چانپ اینڈ کباب۔ انڈر سٹینڈ کروایا تمہاری جان میں جان آئی۔ جب تم چانپیں بھنبھوڑ رہے تھے۔ تو دانشوروں کے سوالات

تمہیں جھنجھوڑ رہے تھے۔

ایک ادیب نے پوچھا۔ "افریقی جدوجہدِ آزادی میں آپ کا کیا رول ہے؟"

تم نے ایک چانپ بھنبھوڑتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ میں نے منہ پھیر لیا۔ ظاہر ہے اتنے آدمیوں کی موجودگی میں ــــــــــ کیا کہنا چاہیے۔ ایسے موقعوں پر نظر چرانا یا منہ پھیر لینا بے حد مفید ثابت ہوتا ہے۔ مگر ان صاحب نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ اپنا سوال دوبارہ سہ بارہ دہرایا۔ تنگ آ کر تم نے ٹشو پیپر سے اپنے ہونٹ پونچھتے اور منہ چلاتے ہوئے کہا "غوں۔ اوں۔ غاں۔ چانپیں بہت مزیدار تھیں۔ ایک پلیٹ اور ــــ"

"تم سے پوچھا گیا" کیا آپ کبھی جیل بھی گئے ہیں۔؟

"تم نے بے دھڑک جواب دیا" کئی مرتبہ۔"

"کس لیے؟" ایک خشک مزاج ادیب نے پوچھا۔

تم نے نہایت صاف گوئی سے کام لے کر کہا "تین مرتبہ تو پڑوسیوں سے مار پیٹ کی وجہ سے جیل گیا۔ دو مرتبہ نائٹ کلب میں پھڈا کیا۔ جیل گیا۔ شاید تین چار مرتبہ اور بھی گیا۔ وجوہات اچھی طرح یاد نہیں۔ غالباً لڑکیوں کا کوئی چکر تھا۔"

ایک لمحے کے لیے دانشوروں کو سانپ سونگھ گیا۔ آخر ایک سنجیدہ مزاج شاعر نے پوچھا "آپ کی کتاب دنیا کی کن کن زبانوں میں چھپی ہے اور وہ کہاں سے دستیاب ہو سکتی ہے؟"

اس پر تم نے کانٹے سے پلیٹ بجا کر مجھے متوجہ کیا اور کہا "بڑے افسوس کی بات ہے۔ اب تک چانپیں نہیں آئیں۔ کیا یہاں بیرے بھی دانشور ہیں۔؟"

ایک بیرے نے بگڑ کر کہا "آپ کو کوئی اعتراض ہے؟"

تم فوراً سنبھل کر مسکرائے۔ بولے "اعتراض تو کوئی نہیں البتہ بھوک سخت لگی ہوئی ہے

براہِ کرم چائنیز جلد تیار کروائیے اور فوراً لائیے۔"

ایک منحنی سے، مدقوق صورت ادیب جو ہمیشہ غیر ملکی ادیبوں کی نایاب کُتب کے مطالعے کا رُعب جھاڑ کر دُوسروں کو اپنی علمی برتری کے زیرِ اثر رکھنے کے شوقین ہیں۔ ذرا قریب آئے، کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ باریک سی آواز میں بولے۔

"وکٹر لمباسہ دنداسہ صاحب۔ آپ نے 'سلاخوں پر زنگ' میں جس جیل کا نقشہ کھینچا ہے کیا وہ تخیلی ہے یا اس کا کوئی حقیقی وجود ہے۔"

"تم نے کہا" زیادہ تر افریقی جیلوں کی سلاخیں زنگ آلود ہیں۔ آپ کس جیل میں گئے تھے؟"

اس پر وُہ مدقوق سے ادیب جھنجھلا کر پیچھے سرک گئے۔ سرگوشی میں بولے۔ بڑا بدلحاظ شاعر ہے۔"

"آج کل کیا لکھ رہے ہیں؟" ایک نوجوان نے پُوچھا۔

"تم نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ مَیں نے فوراً مُنہ پھیر لیا۔ دوبارہ جب تم سے یہی سوال کیا گیا تو تم نے ترت جواب دیا۔" ابھی تک تو مجھے پٹرول پمپ کی ملازمت کے علاوہ دُوسری کوئی ملازمت مل نہیں سکی۔ ممکن ہے آئندہ چند ماہ میں ڈرائیونگ لائسنس مل جائے۔ پھر کرایے پر ٹیکسی لے کر چلایا کروں گا۔"

میں نے کھنکار کر کہا۔ "اوں ۔۔۔ ہوں ۔۔۔ اُوں ۔۔۔ ہوں"

نوجوان افسوس کرتے ہُوئے بولا۔ "اِن کاموں میں تو لکھنے پڑھنے کی فرصت آپ کو نہیں مل سکے گی۔"

"تم نے خالصتاً یورپین انداز میں اپنے شانے اُچکائے اور پلیٹ بجا کر اپنی اُونچی آواز میں کہا۔" ایک پلیٹ چائنیز۔"

مَیں محسوس کر رہا تھا کہ کسی بھی وقت تمہاری افریقی جدّ و جہد آزادی کا دانشور ہونے کا بھانڈا پھُوٹ سکتا ہے۔ لہٰذا قبل اس کے کہ چائنیز کی دوسری پلیٹ (غالباً تیسری) ہماری میز پر پہنچے۔ مَیں حاضرین سے معذرت کرتے ہُوئے اُٹھ کھڑا ہُوا اور تمہارا بازو پکڑ کر تمہیں یاد دلایا۔" وکٹر لمباسہ دنداسہ۔ خُدا کے لیے یہ مت فراموش کرو کہ پرل کان کے ڈنر میں اطالوی دانشور تمہارے علاوہ میرا بھی منتظر ہے۔"

تم فوراً اُٹھ کھڑے ہُوئے۔ باہر آتے ہی تم نے فوراً مجھ سے پُوچھا۔" پرل کان کے ڈنر میں مجھ سے اس قسم کے پریشان کُن سوالات تو نہیں کیے جائیں گے؟"

مَیں نے تم سے مصافحہ کرتے ہُوئے تمہیں یقین دلایا تھا کہ پرل کان چڑیا گھر کے قریب ہے اور اگر تم پرل کان جاؤ گے تو تم سے کوئی سوال نہیں کیا جائے گا، البتہ جو ڈنر تم نوش کرو گے، اس کا بل بہرحال تمہاری توقع سے زیادہ ہو گا اور یہ تمہیں خود ادا کرنا پڑے گا۔ کوئی اطالوی دانشور یہ خدمت سرانجام نہیں دے سکے گا۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اب ہمارے شہر کے چڑیا گھر کا وقت ختم ہونے کی وجہ سے چڑیا گھر کی سَیر کا ارادہ ملتوی کرو۔ کل صبح جا کر بچھوؤں اور دریائی گھوڑوں وغیرہ سے مل لینا اور میرا اسلام کہنا۔ اُمید ہے وُہ تم سے میرے بارے میں کوئی سوال نہیں کریں گے۔

مجھے نہیں معلوم کہ تم نے میرے مطلوبہ جانوروں تک میرا اسلام پہنچایا کہ نہیں، البتہ جب مَیں نے تم سے رُخصتی مصافحہ کرنا چاہا تو تم نے میری رفاقت کا شکریہ ادا کرنے کی بجائے بڑبڑاتے ہُوئے کہا تھا۔" چائنیز اینڈ چائنیز"۔ بہرحال جو چند لمحے تمہاری رفاقت میں گذرے، ان کے بارے میں ہمارے ایک شاعر نے اس طرح کی بات کی ہے:

گذاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں ۔۔۔ انہی کی یاد میری زندگی ہے
تمہارے لیے نیک تمناؤں کے ساتھ،
(ا۔ ا۔ ا۔)

رائٹر کہاں ہے؟

ڈرامے دیکھنے کا ہمیں شوق تو ہے، فرصت نہیں، لیکن کوئی اصرار کرے تو ہم انکار بھی نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ جب احمق قرطاس پوری نے ہمیں اپنا ڈرامہ دیکھنے کی پُرزور دعوت دی تو ہم انکار نہ کر سکے۔ ویسے بھی موسم شدید گرم ہو تو ایئر کنڈیشنڈ ہال میں ڈرامہ یا ورائٹی شو دیکھنے کے بہانے بندہ اطمینان سے دو ڈھائی گھنٹے سو سکتا ہے۔ بقولِ شاعر

ع نیند سولی پہ بھی آجاتی ہے آرام کے ساتھ

چنانچہ ہم ڈرامہ دیکھنے گئے۔ ماشاءاللہ اس میں سب چیزیں تھیں۔ مثلاً اسٹیج، روشنیاں، اداکار، ان کا میک اَپ، مکالمے، پس منظر موسیقی، منتظمِ اعلیٰ، نائب منتظمِ اعلیٰ، مہمانِ خصوصی اور مہمانِ خصوصیاتِ خصوصی وغیرہ۔ البتہ ایک چیز نہیں تھی۔ اور وہ تھا رائٹر۔ بحمداللہ پورا ڈرامہ ہم نے جاگتی آنکھوں سے دیکھا۔ اگرچہ درمیان میں ایک آدھ جھپکی بھی لے لی۔ دو چار جماہیاں اور انگڑائیاں وغیرہ بھی لیں، تاکہ نیند پوری نہ ہو سکے تو کم از کم جسم کو تھوڑا بہت آرام تو مل جائے۔ لیکن ایک سوال ہمیں بار بار پریشان کرتا رہا کہ آخر یہ ہمارے سامنے ہو کیا رہا ہے۔ یہ کسی اسکرپٹ کے تحت ہو رہا ہے تو اس کا رائٹر کون ہے۔ اور یہ کس قسم کا رائٹر ہے اور کیا کہنا چاہتا ہے۔ بہت

غور کیا، خاصا دماغ لڑایا، لیکن یہ عُقدہ وا نہ ہُوا۔ تنگ آکر ہم نے اگلے دن اپنے احمق قرطاس پوری منتظمِ اعلیٰ ڈرامہ ہذا سے پوچھا۔ پہلے تو ان کی سمجھ میں ہمارا سوال نہیں آیا۔ سگریٹ سُلگا کر سر کھجانے لگے۔ اس کام سے فارغ ہوئے تو دوسری مرتبہ سگریٹ سلگایا ادھر سے کچھ اطمینان ہوا تو پھر سر کھجانے کا عمل شروع کر دیا اور آخر میں تیسرا سگریٹ سُلگانے سے پہلے ہم سے پوچھا "آپ کی بات سمجھ میں نہیں آئی ذرا وضاحت کریں۔"

ہم نے گذارش کی۔ "دیکھئے احمق صاحب۔ اپنے تخلص جیسا دوسروں کو مت سمجھئے۔ صرف اتنا بتائیے کہ جو کچھ کل آپ نے دکھایا ہے وہ آپ ہی آپ ہوتا چلا گیا یا اس کے پیچھے رائٹر نامی کوئی چیز بھی تھی؟"

احمق صاحب ہنس پڑے۔ بولے "آج کل رائٹر کی کون سی ضرورت باقی رہ گئی ہے جناب کون سا کام ہے جو ہمارے آرٹسٹ نہیں کر سکتے۔ وہ زمانہ لد گیا، جب ڈرامہ کے لیے ایک رائٹر کا ہونا ضروری تھا، ڈائریکٹر کا ہونا ضروری تھا، اب تو جہاں چار آرٹسٹ جمع ہوئے سمجھ لیں ہٹ پلے تیار ہو گیا۔ بیچ میں کوئی کمی بیشی رہ گئی تو دو چار ٹوٹے ڈال دیئے۔ کوئی ادھر سے کوئی ادھر سے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ ڈرامہ تیار ہے۔ نوش فرمائیں۔"

ہم نے حیرت سے پوچھا "لیکن جس چیز کو اسکرپٹ کہا جاتا ہے آخر وہ بھی تو کوئی درجہ رکھتی ہے تاکہ منظوری کے لیے متعلقہ افراد کے سامنے پیش کی جا سکے اور ڈیٹ مل سکے۔"

اس پر ہمارے احمق صاحب قہقہہ مار کے ہنسے بلکہ چھاپا مار کے ہنسے۔ دیر تک ہماری لاعلمی، بے خبری اور نان ٹیکنیکل ہینڈ ہونے کا ذکر کر کے وقفے وقفے سے چکر کھا کر قہقہوں کے پٹاخے چھوڑتے رہے۔ آخر میں ازراہِ شفقت فرمایا "سوچ سوچ کر اپنی صحت خراب نہ کریں۔ بھائی میرے۔ اب ہر چیز سسٹم کے تحت ہے۔ ڈیٹ لینا۔ ڈیٹ بیچنا۔ ڈیٹ آگے سپلائی کرنا۔ اسکرپٹ کی جلد بندی کروانا۔ اس کی منظوری لینا۔ آرٹسٹوں سے معاوضے

جلے کرنا۔ ڈرامہ کرنا۔ سٹیٹیں بیچنا۔ انکم میں ہیر پھیر کرنا۔ مہمانِ خصوصی پکڑنا۔ سپانسر پھانسنا۔ پبلسٹی کے ٹوٹکے چلانا۔ یہ سب ایک ٹیکنیکل مہارت اور سسٹم سے گہری واقفیت کے بعد ہی ممکن ہے اور آپ ہیں کہ ڈرامے میں رائٹر ڈھونڈ رہے ہیں۔ موتیوں والی سرکار۔ رائٹر تو بعد کی بات ہے۔ ہم تو ڈائرکشن بھی آرٹسٹوں میں بانٹ لیتے ہیں۔"

ہم نے کہا "یہی وجہ ہے کہ ہمارا اسٹیج ڈرامہ روز بروز اس سطح سے نیچے پھسل رہا ہے جسے معیار کہتے ہیں۔"

"معیار؟" احمق صاحب چنگھاڑ کر بولے "کس چیز کا معیار؟ ڈرامے کا؟ صرف ڈرامے کا؟ کیوں جی سیمنٹ کا معیار کیوں نہیں؟ گھی کا معیار کیوں نہیں؟ لال مرچوں کا معیار کیوں نہیں؟ ہمارے اجتماعی اخلاق کا معیار کیوں نہیں؟ صرف ڈرامے ہی کا معیار کیوں؟ آپ تنقید نگاروں کو فائن آرٹ کے ہر شعبے کی غلطی فوراً نظر آجاتی ہے۔ فوراً آپ ڈنڈا لے معیار معیار کرتے ہوئے فنونِ لطیفہ پر ٹوٹ پڑتے ہیں، اور جو حقیقی زندگی کے ڈب کھڑبے معاملے ہیں، مسائل ہیں، چیزیں ہیں۔ ان پر واویلا کیوں نہیں کرتے۔ کبھی آپ نے چائے کی پتی کے غیر معیاری ہونے کا تخلیقی اور تنقیدی سطح پر نوٹس لیا ہے؟ لیا ہے تو ریکارڈ پر لائیں، ہمیں دکھائیں۔"

ہم نے کہا "اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ہر غیر معیاری کام کو اس لیے قبول کرتے چلے جائیں کہ دنیا کی دیگر چیزیں کونسی معیاری ہیں؟ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔"

احمق قرطاس پوری نے آٹھواں سگریٹ سلگا کر اطمینان سے دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔ "اچھا تو آپ معترض حضرات کریں جو ہمارا کرنا ہے۔ کروالیں برآمدگی ہمارے اسکرپٹوں اور ڈراموں سے رائٹر کی۔ جب یہ رائٹر آپ کو دستیاب ہو جائے تو ہمیں بھی دکھائیے۔ تاکہ ہمیں بھی خوشی ہو کہ کھویا ہوا رائٹر ڈرامے کی دنیا میں لوٹ آیا ہے۔ ورنہ خالی خولی تنقیدیں نہ کریں۔ ٹکٹ خریدیں اور چپ چاپ بیٹھ کے ڈرامہ دیکھیں۔ آئی سمجھ۔"!

ایوارڈ لے لو ایوارڈ!

ایک صاحب پسینے میں شرابور، بال بکھرائے، آنکھوں میں وحشت اور چہرے پر عجلت لیئے ہمارے پاس آئے۔ کہنے لگے۔ "میں ایک ثقافتی تنظیم کا نائب صدر ہوں۔ ہم آپ کو ایوارڈ دینا چاہتے ہیں۔"

ہم نے پوچھا۔ "مگر ہمارا کیا قصور؟"

بولے "یہ ایوارڈ آپ کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر آپ کو دیا جائے گا۔"

ہم نے پوچھا۔ "مگر ثقافتی تنظیم کا ادبی خدمات وغیرہ سے کیا تعلق؟"

بولے "ہم قوالوں، سازندوں، طبلہ بجانے والوں اور مختلف انداز میں دکھی انسانیت کی خدمت کرنے والوں کے علاوہ ادیبوں کو بھی ایوارڈ دیتے ہیں۔ اس طرح ادیب اور صحافی بھی خوش ہو جاتے ہیں اور ہماری تنظیم کی خبریں وغیرہ ذرا اچھی طرح چھپ جاتی ہیں۔"

ہم نے پوچھا "آپ کی تنظیم ایوارڈ کا فیصلہ کیسے کرتی ہے۔ آپ خود اکیلے بیٹھ کے من پسند فہرست بنا لیتے ہیں یا یہ کام کوئی کمیٹی وغیرہ کرتی ہے۔"

کہنے لگے۔ "کچھ عرصہ تک تو میں اکیلا ہی یہ کام کرتا رہا۔ اب ایک کمیٹی بنالی ہے۔ اس میں بڑے مشہور لوگ شامل ہیں، مثلاً حاجی تبریز خان کٹار، میونسپل ڈائریکٹر، شیخ بدرالدین بادل، دانشور، میاں غلام مرتضےٰ جھنجھٹ، صحافی، محمد شریف آوارہ فوٹو گرافر،

اور محترمہ ناز پرور بدایونی نقاد اور مبصر اور حکیم گل بنفشہ صاحب، ماہر طب و جراحت"

ہم قائل ہو گئے۔ بولے "واقعی یہ تمام نام مشہور ہی نہیں صرف مشہور ہی نہیں بہت مشہور ہیں۔ مگر بہتر ہوتا کہ آپ ادب کا ایوارڈ دینے والی کمیٹی میں کم از کم ڈاکٹر جمیل جالبی ڈاکٹر فرمان فتح پوری یا ڈاکٹر سلیم اختر کو شامل کر لیتے۔"

بولے "یہ تینوں ڈاکٹر صاحبان کس ہسپتال میں کام کرتے ہیں۔ اگر ان کے پرائیویٹ کلینک کا کوئی فون نمبر ہو تو مجھے دیجئے۔ ہم ڈاکٹری خدمات کے ایوارڈ وغیرہ کے لیے ان سے مل لیں گے۔"

ہم نے کہا "بدقسمتی سے یہ ڈاکٹر صاحبان اُوپر کی آمدنی کے لیئے تحقیق یا تنقید تک ہی محدود ہیں پرائیویٹ کلینک نہیں کھولتے۔ آپ احمد ندیم قاسمی صاحب کو ادبی ایوارڈ کمیٹی میں لے لیجئے۔"

وہ حیران ہو کر بولے "یہ کون صاحب ہیں۔؟"

ہم نے جل بھن کر کہا "یہ ٹھوک میں لٹھا بیچتے ہیں۔ آپ کو چاہئے تو ہماری چٹ لے جائیے۔ انشاء اللہ آپ کا کام ہو جائے گا۔ لٹھے کے علاوہ بیری کے پتے، کافور اور عرق گلاب وغیرہ بھی وہ سستے داموں دلوا دیں گے، بہت وضع دار بزرگ ہیں۔"

کہنے لگے "کچھ اور نام بتائیے ——؟"

ہم نے کہا "احمد فراز کو آزمایئے۔؟"

وہ سوچ میں پڑ گئے۔ بولے "یہ وہی احمد فراز تو نہیں جو شاعر ہیں اور مہدی حسن کی غزل پڑھتے ہیں۔"

ہم نے کہا "آپ ٹھیک سمجھے۔ مہدی حسن اور عنایت حضروی کی اکثر غزلیں یہی پڑھتے ہیں۔ حالانکہ انہیں بارہا ہم نے سمجھایا بھی ہے کہ اپنی غزلیں پڑھا کیجئے ——

مگر یہ مانتے نہیں۔"

نیم دلی سے بولے "ٹھیک ہے۔ ایک نام تو یہ ہو گیا۔ باقی نام؟"

ہم نے کہا "فی الحال ایک ہی کافی ہے۔ پہلے آپ ان سے مل کر دیکھئے کیا کہتے ہیں، بعد میں ہم سے ملئے۔ ہم اکادمی ادبیات پاکستان کی وہ ڈائریکٹری آپ کو عاریتاً بُرائے مطالعہ دے دیں گے جس میں ملک بھر کے ادیبوں اور غیر ادیبوں کے نام پتے اور ٹیلی فون نمبر درج ہیں۔"

وہ کچھ دیر خاموش بیٹھے ہمارا منہ تکتے رہے۔ پھر اُٹھنے کے انداز میں بولے۔

"تو پھر ہم آپ کو دے دیں ایوارڈ ادبی خدمات کا ——؟"

ہم نے کہا "آپ مُصر ہیں تو یہی سہی۔"

وہ قدرے جھجکے۔ بدکے۔ پھر رازداری سے بولے "خرچہ ایوارڈ آپ کے ذمے"

ہم نے چونک کر پوچھا "کیا مطلب؟"

وہ بڑی لاپرواہی سے بولے "اب تک تو ہماری تنظیم کا یہی اصول رہا ہے کہ چند ایک کو چھوڑ کر باقی جس کو ایوارڈ دیا جائے، اس سے خرچہ لیا جائے، آپ کو معلوم ہی ہے کہ پیسوں کے بغیر کوئی ہوٹل ٹیک نہیں ہو سکتا اور کہیں بھی نمایاں پبلسٹی نہیں ہو سکتی۔"

ہم نے کہا "جب حالات اتنے ناگفتہ بہ ہیں تو آپ ایوارڈ سازی کے چکر میں پڑتے ہی کیوں ہیں؟ دُنیا میں اور بھی نیک کام ہیں۔ وہ کیجئے۔؟"

یہ سُن کر ان کی آنکھوں میں جیسے بلب سے جلنے بجھنے لگے۔ انتہائی لاتعلقی سے بولے "خیر آپ خرچہ نہیں دینا چاہتے مت دیں۔ ہم اس سال ادبی خدمات کا ایوارڈ اللہ دسایا زخمی کو دے دیں گے۔"

ہم نے تعجب سے پوچھا "یہ زخمی صاحب کون ہیں؟"

بولے "کمال ہے۔ آپ اتنی مشہور شخصیت کو نہیں جانتے۔ بھئی آپ ہی کے محلے میں رہتے ہیں۔ پان مصالحے کا کاروبار کرتے ہیں۔ اچھی اسامی ہیں۔ جندجان پان مصالحہ انہی کا تیار کردہ ہے۔ شعر و شاعری اور ادب تہذیب سے بھی انہیں گہری دلچسپی ہے۔ اکثر قوالوں وغیرہ کو بلاتے رہتے ہیں۔"

ہم نے کہا "بہتر ہے۔ اس سال کی ادبی خدمات کا ایوارڈ سرِدست انہی کو دے ڈالئے۔ اگلے برس تک اُمید ہے ہم مالی طور پر اس ایوارڈ کے مستحق ہو جائیں گے۔ پھر آئیے گا۔"

جب وُہ جانے کے لیے پلٹے تو غور سے ہم نے ان کا عقبی جائزہ لیا۔ ان کی قمیص کا کالر بوسیدہ ہو کر اُدھڑ چکا تھا اور دونوں بوٹوں کے تلوے اس طرح گھس گئے تھے کہ مزید گھسنے کی گنجائش نہیں تھی۔ ہمیں ان پر رشک آیا۔ علم و ادب اور ثقافت کی خدمت کرنے والے ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں۔ بے لوث اور بے غرض۔

بچارے قلم جیب میں، ڈائری بغل میں دابے گلیوں گلیوں ہلکان پھرتے ہیں، نہ کھانے کا ہوش، نہ کپڑے لتے کی فکر۔ بس ذہن پر ایک ہی دُھن سوار کہ جیسے بھی بن پڑے ادب یا ثقافت کی خدمت کر ڈالی جائے۔ اس نفسانفسی کے عالم میں اور اس کمپرسی کے دَور میں ایسے لوگ مبارک باد کے مستحق ہیں، جو علم، ادب یا ثقافت کو خدمت کے قابل سمجھتے ہیں۔ مگر کیسی خدمت کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے۔!

تھاں ماردیاں گا!

ہمیں اپنی فلم انڈسٹری کی مستقل مزاجی پر رشک آتا ہے۔ چالیس بیالیس سال سے وُہی ٹیکنیشن ہیں، وُہی ترکیبیں ہیں، وُہی فارمولے ہیں، وہی ڈانگ سوٹے ہیں، وُہی ٹرکیں ہیں اور وُہی ڈزا ڈز تے کھچا کھچ ہے۔ دُنیا کہاں سے کہاں جا پہنچی، مگر ہمارے فلمی منشی صاحبان اب تک اس غور و فکر سے باہر نہیں نکلے کہ سچوئیشن میں گیت کی گنجائش کیسے نکالی جائے اور ہیرو کی انٹری کیسے ڈالی جائے۔ کل ہی کی بات ہے کہ مجید گل بکاؤلی صاحب بڑے پریشان، آشفتہ و دیگر ہمارے پاس پہنچے اور کہنے لگے "بڑی مشکل میں پھنس گیا ہوں، سمجھ میں نہیں آتا، کیا کروں؟"

ہم نے پُوچھا۔ "مسئلہ کیا ہے؟"

بولے "ہیرو جیل سے چھوٹ کر ماں سے ملنے گھر آرہا ہے۔ ماں نے گھر میں مجرے کا انتظام کر رکھا ہے۔ اب پریشانی یہ ہے کہ ہیرو کی انٹری کیسے ڈالی جائے۔"

ہم نے کہا "ویسے ہی ڈال دیجئے، جیسے آج تک ڈالتے آئے ہیں۔"

بولے "نہیں، اس طرح بات نہیں بنتی۔ ہر فلم میں تھوڑا بہت فرق رکھنا ہی پڑتا ہے۔ مثلاً پچھلی فلم میں ہم نے ہیرو کو گھوڑے سے درخت پر اور درخت سے اپنے گھر میں چھلانگ مارتے دکھایا تھا، عین اس وقت اس کی انٹری ڈالی تھی،

جب اس کی بہن کی ڈولی رُخصت ہو رہی تھی۔ اب سچوئشن اتنی ڈرامائی نہیں، ہیرو قتل کے الزام سے باعزّت بری ہو کر اپنے حواریوں کے ساتھ چار کھُلی جیپوں میں گھر آ رہا ہے، جہاں اس کے استقبال کے لیے مجرے کا اہتمام کیا گیا ہے۔"

گھنگرو ہم نے کہا: "اب آپ گھنگروؤں سے سین اوپن کریں، جو رقاصاؤں نے پہن رکھے ہیں، ہیرو کی مسلسل فائرنگ سے ایک ایک گھنگھرو ٹوٹتا جاتا ہے اور فریم میں ہیرو کا وزنی پاؤں داخل ہوتا ہے جو عین طبلے پر پڑتا ہے۔ اوئے۔ بند کرو۔ یہ کھسپ خانہ۔ تھاں ماردیاں گا۔"

یہ سُنتے ہی مجید گل بکاؤلی فرطِ مسرّت سے اُچھل پڑے۔ ناچ اُٹھے۔ کہنے لگے۔ "اسے کہتے ہیں خُداداد صلاحیّت۔ کیا انٹری ڈالی ہے۔ آپ فلمی کہانیاں کیوں نہیں لکھتے؟"

ہم نے کہا: "گُل بکاؤلی صاحب۔ اگر ہم فلمی کہانیاں لکھنے لگے تو آپ کا کیا بنے گا۔ یہی سوچ کر ہم اس شعبے کا رُخ نہیں کرتے کہ کسی کی روزی پر لات مارنا اچھی بات نہیں۔"

بولے: "یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ آپ کیا، احمد ندیم قاسمی بھی ہماری روزی پر لات نہیں مار سکتے۔ کیونکہ سین یو تو ہم نے لکھنا ہوتا ہے، کہانی میں حسبِ خواہش ردّ و بدل تو ہم کرتے ہیں، کوئی مائی کا لال اس شعبے میں ہمارے لیے مشکلات کھڑی نہیں کر سکتا۔"

ہم نے پُوچھا: "غالباً اس لیے کہ کاسٹ اور کہانی ہر جگہ تقریباً ایک ہی ہوتی ہے، صرف لباس اور گٹ اپ بدلنا پڑتا ہے۔"

بولے: "اس کی ضرورت نہیں پڑتی، اس وقت شہر کے جتنے سینما گھر ہیں، ان کا ایک چکر لگا کے فلموں کے پوسٹر دیکھ لیجیے۔ صاف پتہ چل جائے گا کہ ایک ہی ہیرو کی مونچھیں درجن بھر فلموں کی کفالت کر رہی ہیں۔ اسے اتنی فرصت کہاں کہ مونچھوں کا سائز تبدیل کرے، البتہ وہ لاچے کُرتے اور چادر وغیرہ میں تھوڑی بہت تبدیلی کر لیتا ہے۔"

"حالانکہ اسے اداکاری میں تبدیلیاں کرنی چاہئیں۔" ہم نے کہا۔

"یہی کام مشکل ہے۔" مجید گل بکاؤلی نے کہا: "ہمارے ہیرو کے پاس ان فضول باتوں پر سوچ بچار کے لیے وقت نہیں۔"

"کیا ہمارے اداکار اسکرپٹ پڑھتے نہیں۔ کہانی سُنتے نہیں؟" ہم نے حیرت سے پُوچھا۔

وُہ ہنسے۔ بولے: "جس ہیرو نے پچاس فلمیں ایک ہی وقت میں سائن کر رکھی ہوں، اس کے پاس اتنا وقت کہاں سے آئے کہ وہ اسکرپٹ کی باریکیوں پر غور کرے، یہ کام مصنّف ہدایت کار اور کیمرہ مین کا ہے۔ ہیرو کو تو صرف یہ اطلاع دینی پڑتی ہے کہ سیٹ تیار ہے، اب آپ تشریف لے آئیں، اور ہمارا ہیرو پہنچ جاتا ہے۔ ابھی ساتھ والے فلور پر وہ جس اداکارہ کو بہن کہہ کر اس کے سر پر اوڑھنی رکھ رہا تھا اسی کے ساتھ دوسرے فلور پر اسے بادلوں کی چمک، بجلی کی کڑک اور موسلا دھار بارش کے دوران اظہارِ محبت کرنا ہے تیسرے فلور پر اسے ماں کی لاش کاندھے پر اُٹھا کر ہجوم کے سامنے قاتلوں سے نمٹنے کا عہد کرنا ہے چوتھے فلور پر اسے پولیس مقابلہ کرنا ہے۔ اس کے بعد آؤٹ ڈور شوٹنگ ہے جس میں وُہ ہیروئن سے بدگمان ہو کر جا رہا ہے کہ یکایک ویرانے میں طبلے کھڑکتے ہیں، گھنگھرو بجتے ہیں، اور ہیروئن گاتی ہُوئی اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے۔"

ہم نے کہا: "کیا پُوری انڈسٹری میں ایک بھی ایسا بھی آدمی نہیں کہ جو تشدّد، جرائم قتل، ڈاکے، خُون، گولی اور بندوق سے ہٹ کر بھی کچھ سوچے۔"

"ہیں کیوں نہیں ——!" گُل بکاؤلی نے کہا "بے شمار ہیں —— لیکن ——"

ہم نے جلدی سے پُوچھا: "لیکن کیا؟"

وہ ہنس کر بولے: "لیکن نہ وُہ فلمیں لکھتے ہیں، نہ بناتے ہیں، آپ کی طرح گھر میں

بیٹھے سوچتے رہتے ہیں کہ ہماری فلموں کا معیار بلند ہونا چاہیئے، ان کے موضوعات میں تبدیلی آنی چاہیئے، یہ ہونا چاہیئے، وہ ہونا چاہیئے لیکن ہوتا وہی ہے جو ہم چاہتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ لہراتے ہوئے اُٹھے، اپنے مُنہ میں اُلٹا ہاتھ رکھ کر زوردار الفاظ میں بیّا بیّا کا نعرہ لگایا اور گرج دار آواز میں کہا۔" اوئے چُپ کر جا ٹیبل ٹاکرا ـــــ ورنہ تھاں ماردیاں گا ـــــ خُدا حافظ ـــــ"

یہ کہہ کر دروازے کو ایک ٹھوکر رسید کی اور یہ جا وُہ جا ـــــ

وُکھری ٹیپ کی ضرورتیں !

باقر صاحب صحافی بھی ہیں، شاعر بھی اور ادیب بھی۔ ابھی صحافت کی ٹہنی پہ چہچہا رہے ہیں، پلک جھپکی تو پھُر سے اُڑ کر ادب کی شاخ پر جا بیٹھے۔ وہاں سے اُڑے تو مشاعرے کے پنڈال میں جا پہنچے۔ الغرض کوئی بھی میدان ہو، باقر صاحب کی دسترس سے محفوظ نہیں، ابھی حال ہی میں انکشاف ہُوا ہے کہ وہ محض ادیب شاعر یا صحافی نہیں، سماجی اور سیاسی کارکن بھی ہیں، ثقافتی امور میں بھی مداخلت سے باز نہیں آتے۔ ڈیکیٹیل گھڑی خراب ہو جائے تو اسے بھی ٹھیک کر لیتے ہیں۔ دی سی آر بگڑ جائے تو اسے بھی چلا لیتے ہیں۔ محلّے میں کہیں سر پھٹول ہو جائے تو نقصان کی تلافی کے لیے آپ اصلاحی کمیٹی میں بھی موجود ہیں۔

ہمیں بجا طور پر فخر ہے کہ اتنی خُوبیوں کے مالک باقر صاحب ہمارے پڑوسی ہیں۔ یعنی ہم ان کے پڑوسی ہیں۔ وہ انسدادِ تمباکو نوشی کی کمیٹی کے نائب صدر بھی ہیں، اور لوگوں کو تمباکو نوشی کے نقصانات سے آگاہ کرنے کے لیے ہر وقت سگریٹ پیتے رہتے ہیں، کل وُہ پھکا پھک سگریٹ پھُونکتے ہُوئے ہمارے پاس آئے اور ایک رسالہ ہمارے آگے رکھ کر بولے۔" ذرا اسے دیکھ لیں۔"

ہم نے پُوچھا۔" اس میں کیا ہے۔ آپ کی کوئی تازہ غزل یا افسانہ؟"

جواباً انہوں نے رسالہ کھول کر ہمارے سامنے رکھ دیا۔ یہ سچی کہانیاں وغیرہ چھاپنے والا ایک رسالہ تھا اور ہماری ناک کے عین سامنے پیغامات کا صفحہ تھا۔ اس میں کہیں شادی کی استدعا تھی، کہیں قلمی دوستی کی گذارش تھی، کہیں ترکِ تعلق کرنے والوں کی خدمت میں دُعائیں ارسال کی گئی تھیں۔ چند پیغامات بہنوں کی ضرورت کے بارے میں تھے، جو بہن کے پیار کو ترسے ہُوئے بھائیوں نے چھپوائے تھے اور سب سے پہلے خط لکھنے والی بہن کو ایک عدد قیمتی تُحفہ پیش کرنے کی خُوشخبری بھی سُنائی گئی تھی۔ باقر صاحب نے بہنوں کی طلب والے پیغامات کو سُرخ پنسل سے انڈرلائن کر رکھا تھا۔ ہم نے پُوچھا۔ "یا حضرت! اس کی وجہ؟"

کہنے لگے۔ "صاحب! مَیں اِس قسم کے فضول اشتہار کے سخت خلاف ہوں، اور باقاعدہ اس رُجحان کے خلاف مہم چلانا چاہتا ہوں۔"

ہم نے کہا "بظاہر تو یہ اشتہارات یا پیغامات بے ضرر یا معصوم لگتے ہیں۔ آپ کو ان کی اشاعت سے کیا تکلیف پہنچی ہے؟" اس پر وہ ہنسے۔ جیب سے چند خطوط نکال کر ترتیب وار ہمارے سامنے رکھ دیئے۔ بولے "ذرا انہیں بھی پڑھ لیجئے۔ ایک مرتبہ ہم نے بہن بن کر ایک صاحب کو خط لکھا تھا جواباً انہوں نے افسانۂ دردِ دل بھیج دیا۔"

ہم نے دانستہ انجان بن کر کہا۔ "اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ ایک دُکھی بھائی نے اشتہار چھپوایا۔ آپ نے ہمدرد بہن بن کر انہیں خط لکھا۔ اب اگر وُہ اپنے دل کا حال سُنانے بیٹھ گئے تو بُرا ماننے کی کیا بات ہے۔ بھائی آخر بہن سے دل کی بات نہیں کہے گا تو کس سے کہے گا۔؟"

بولے "یہ دُوسری قسم کے بھائی ہیں۔ اشتہار بھائی بن کر چھپواتے ہیں، خط محبوب بن کے لکھتے ہیں۔"

ہم نے کہا "سب تو ایسا نہیں کرتے ہوں گے۔ ایک آدھ کا ذہن اگر خراب ہو تو ہونے دیجئے۔ آپ دوسروں کو بھی خط لکھ کر آزمائیے۔"

بولے "آزما لیا ہے۔"

پوچھا "نتیجہ کیا رہا؟"

کہنے لگے۔ "وُہی ڈھاک کے تین پات۔ دراصل ضرورت رشتہ کے کالم بعض شادی دفتروں کی وجہ سے اتنے بدنام ہوگئے ہیں کہ سنجیدہ لوگ ان پر توجہ نہیں دیتے اب لوگوں نے یہ شارٹ کٹ نکالا ہے۔ اوّل تو بہن کی محبت کو ترسنے والے لوگ کبھی اشتہار بازی کے چکّر میں نہیں پڑتے۔ دوم اگر بہن کے نہ ہونے سے ایسا ہی ان پر نزع اور جانکنی کا عالم طاری ہو تو سب سے پہلے خط لکھنے والی بہن کو ایک عدد قیمتی تحفے کا لالچ نہیں دیتے۔ جب کوئی جذبہ یا رشتہ، نمود و نمائش اور لالچ و ترغیب کے کانٹوں میں اُلجھ پڑتا ہے، تو ایسے ہی اشتہارات جنم لیتے ہیں۔ حکومت کو چاہیئے کہ اشتہار بازی کے اس رُجحان کا سختی سے نوٹس لے۔"

ہم نے کہا "حکومت بیچاری کس کس رجحان کا نوٹس لیتی پھرے۔ معاشرے میں نوٹس لینے والے دوسرے شعبے کیا کم تھے کہ آپ نے ایک اور مسئلہ کھڑا کر دیا ہے لِلّٰہ اسے خود حل کیجئے۔"

باقر صاحب تو خیر یہ وعدہ کر کے چلے گئے کہ وُہ اپنے طور پر اس مسئلے کا کوئی حل ڈھونڈیں گے۔ البتہ بہن کے پیار کو ترسے ہُوئے ایک بھائی کا خط ہمیں دے گئے جسے ان کے جانے کے بعد سے اب تک ہم کئی مرتبہ پڑھ چکے ہیں۔ اس بھائی نے

باقر بہن کو لکھا تھا:۔

پیاری بہن! پچھلے سات آٹھ صفحات میں مَیں نے مختصراً اپنا دردِ دل بیان کرنے کی کوشش کی ہے اگر آپ نے انہیں غور سے پڑھا ہو گا تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ہر صفحے پر میرے خونِ جگر کے چھینٹے ہیں اور میرے آنسوؤں کی برکھا ہے۔ مَیں اتنا دُکھی اور اس قدر ناکام و نامراد شخص ہوں کہ آپ مجھے دیکھ کر خود پر قابو نہ پا سکیں گی اور آپ کے مُنہ سے خوف کی ایک چیخ نکل کر افق کی بیکرانی میں گُم ہو جائے گی۔

میرے خوابوں کی ملکہ ——— مزید میرے صبر اور ضبط کا امتحان نہ لیں، بوالہوسی ڈاک اپنی تصویر بھیجیں اور اس کے ساتھ ہی ملنے کا وقت اور ٹھیک ٹھیک پتہ تحریر کریں۔ تاکہ دھڑکتے ہُوئے دل کو ہاتھوں سے سنبھالے میں درِ جاناں پر ایک عدد قیمتی تحفے کے ساتھ خود حاضر ہو سکوں۔

جنم جنم سے آپ کی دید کا پیاسا

محمد شریف عاصی

موضع چک بیاسی

کدوں فیض پاسی؟



میڈم سو رہی ہیں

ایک دَور تھا کہ ہم فلمی پریوں کے عاشق تھے اور جنّات کی طرح ان کا طواف کرتے تھے۔ ان سے انٹرویو کرتے تھے اور ان سے گفتگو کر کے مشامِ جاں کو معطّر رکھتے تھے کون سی اداکارہ گوبھی گاشت پسند کرتی ہے۔ کس اداکارہ کے کس شوہر نے کس بات پر اسے کب طلاق دی، کس اداکارہ کو کون سی خوشبو پسند ہے۔ کس اداکارہ نے اپنے پرستاروں کے نام کیا پیغام دیا ہے۔ کس اداکارہ کے اپینڈکس کا آپریشن کب ہُوا۔ کس اداکارہ نے کتنے لاکھ میں کون سی کوٹھی کہاں بنوائی۔ یہ اور اس قسم کے ہزاروں سوالات کے جوابات سیاق و سباق کے ساتھ ہمیں یاد تھے۔ لوگ ہماری ہیروئن شناسی پر فخر کرتے تھے اور ہیروئنوں کے سلسلے میں جب کوئی سوال انہیں پریشان کرتا تھا تو وہ ہم سے رجوع کرتے تھے۔

مگر اب مدّت سے ہم نے یہ شغل ترک کر دیا ہے۔ لوگ پُوچھتے ہیں کہ آخر کیا وجہ ہے کہ اب ہم ہیروئنوں سے انٹرویو نہیں کرتے۔ ہم بات ٹالنے کے لیے یا تو موسم کا ذکر لے بیٹھتے ہیں یا مہنگائی کا تذکرہ چھیڑ دیتے ہیں۔ یا آئیں بائیں شائیں کر کے رہ جاتے ہیں۔ اب ہر شخص کو کون بتاتا پھرے کہ انٹرویوز سے ہمارے فرار کی وجہ تسمیہ کیا ہے۔ یہ اچھا بے ضرر اور دلچسپ شغل ہم نے ترک کیوں کر دیا۔

مُبارک علی دل پھینک نوجوان صحافی ہیں، حال ہی میں ایک شو بزنس میگزین سے

وابستہ ہوئے ہیں خط پُرعزم ہیں اور بغل میں ڈائری اور کندھے پر کیمرہ لٹکا کر صبح گھر سے نکلتے ہیں، رات کو پولیس ناکوں سے شناخت کروا کے واپس گھر لوٹتے ہیں۔

ایک روز انہوں نے ہمیں سینئر صحافی کہہ کر ہمارے تجربات سے افادے کے لئے ہماری وہ پرانی نوٹ بک برائے مطالعہ مستعار مانگ لی جس میں فلمی پریوں اور فلمی جنات وغیرہ کے فون نمبر درج تھے۔ اس بوسیدہ، کرم خوردہ اور خستہ حال ڈائری کا انہوں نے تین چار دن تک مطالعہ بغور فرمایا اور ان ریمارکس کے ساتھ ڈائری ہمیں واپس کر دی۔

"آپ نے تو جناب مجھے مصیبت میں پھنسا دیا ہے۔"

ہم نے پوچھا "عزیز من۔ وہ کس طرح؟"

کہنے لگے "جو نمبر ڈائل کرتا ہوں آگے سے جواب ملتا ہے، سوری رانگ نمبر۔"

ہم نے کہا "عزیز من! ڈائری کے سال اشاعت پر بھی غور کر لیتے۔ بہرحال آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ نمبر بدل گئے ہیں اور نئے نمبر ہمارے پاس نہیں ہم یہ شعبہ چھوڑ چکے ہیں۔"

وہ مایوس ہو کر چلے گئے۔ چند دنوں بعد ایک تقریب میں ملاقات ہوئی۔ خاصا چہک رہے تھے۔ کہنے لگے "مبارک ہو جناب۔ میں نے بہت سے نمبر ٹریس آؤٹ کر لیے ہیں۔ بڑی مشکلوں سے ہاتھ لگے ہیں۔"

ہم نے کہا "چلئے اچھا ہوا۔ آپ کی پریشانی دور ہوئی۔"

کہنے لگے "دور کہاں ہوئی صاحب! پریشانی تو اب شروع ہوئی ہے۔"

ہم نے پوچھا "اب کیسی پریشانی؟"

بولے "جو بھی نمبر ڈائل کرتا ہوں، آگے سے جواب ملتا ہے میڈم شوٹنگ پر ہیں،

اسٹوڈیو سے رابطہ کرتا ہوں تو جواب ملتا ہے میڈم ابھی نہیں پہنچیں۔"

ہم نے کہا "اس کا بہتر حل یہ ہے کہ آپ خود اسٹوڈیو چلے جائیں اور جس کا انٹرویو کرنا ہو، اس سے مل لیں۔"

بولے "یہ بھی کر چکا ہوں۔ لیکن بات نہیں بنتی۔ جس ہیروئن کا انٹرویو کرتے جاتا ہوں، اوّل تو وہ ملتی نہیں، مل جائے تو بات نہیں کرتی۔ بات کرے تو انٹرویو نہیں دیتی۔ انٹرویو دے دے تو تصویریں نہیں دیتی۔ گھر جا کر ملنا چاہتا ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ میڈم سو رہی ہیں۔"

ہم نے کہا "خیر۔ گھبرانے کی بات نہیں۔ اس فیلڈ میں ایسا ہوتا ہے۔ آپ اپنی دھن میں لگے رہیں۔ کامیاب ہو جائیں گے۔"

اس پر انہوں نے وعدہ کیا کہ ہمارے مشورے پر عمل کریں گے اور کامیابی سے ہمکنار ہو کر رہیں گے۔

کچھ عرصے بعد وہ بڑے مایوس، دل گرفتہ اور پریشان حال ہمارے پاس آئے، کہنے لگے "جناب، میرے ساتھ بہت برا ہوا۔"

ہم نے انہیں تسلی دی۔ چائے منگوائی اور ان کی درد بھری عبرت انگیز داستان سننے لگے۔

انہوں نے بتایا کہ پچھلے چند دنوں سے ان کے ذہن میں ایک ہی دھن سوار تھی کہ فلاں ہیروئن کا انٹرویو کریں۔ جب بھی گھر پہ فون کیا، معلوم ہوا میڈم سو رہی ہیں۔ ایک روز انہیں ضد ہو گئی کہ بہرصورت میڈم کو جگا کے رہیں گے، لہٰذا انہوں نے صبح دس بجے میڈم کو فون کیا۔

معلوم ہُوا کہ میڈم سو رہی ہیں۔

دِل پھینک نے پُوچھا، "کب جاگیں گی؟"

جواب ملا "بارہ بجے پتہ کریں۔"

انہوں نے ٹھیک بارہ بجے پتہ کیا۔ معلوم ہُوا۔ میڈم بدستور سو رہی ہیں۔ آپ چار بجے پتہ کریں۔ انہوں نے چار بجے فون کیا۔ وُہی جواب ملا۔ چھ بجے فون کیا۔ وہی جواب ملا۔ سات بجے فون کیا تو معلوم ہُوا کہ اسٹوڈیو تشریف لے گئی ہیں۔ شوٹنگ پر۔ اسٹوڈیو گیا تو معلوم ہُوا کہ میڈم نہیں پہنچیں، کیونکہ آج ان کی کوئی شوٹنگ نہیں۔ وہ گذشتہ بیس دن سے آؤٹ ڈور کے لیے چترال گئی ہُوئی ہیں۔

مبارک علی دل پھینک نے ایک تھکی تھکی جمائی لے کر کہا "اب یہ حالات ہیں۔ آپ خود سوچیں، فلمی صحافت کیا خاک ترقی کرے گی۔ میں تو تنگ آ کر سوچ رہا ہوں کہ یہ فیلڈ ہی چھوڑ دوں۔ کیا خیال ہے آپ کا۔؟"

ہم نے ان کے شانے تھپک کر انہیں تسلی دی۔ البتہ اپنے دل میں ضرور کہا۔

"آپ تو میاں اب اس فیصلے پر پہنچے ہیں، ہم نے تو یہ فیصلہ برسوں پہلے کر لیا تھا۔ پہلے میڈیں سوتی تھیں، اب ہم سوتے ہیں اور چین کی نیند سوتے ہیں۔"

ڈزا ڈز تے کھچا کھچ

حال ہی میں ہم نے ایک پنجابی فلم دیکھی ہے اور سینما ہال سے باہر نکل کے اب تک سوچ رہے ہیں کہ اپنے علاقے کے ڈپٹی کمشنر کو ایک درخواست دیں۔

بخدمت جناب ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر دام ظلکم،

جنابِ عالی!

نہایت ادب سے گذارش ہے کہ ہم انتہائی شریف اور پُرامن شہری ہیں اور ہماری استدعا یہ ہے کہ براہِ کرم ہمیں چند کلاشنکوفیں، جیپیں اور اسلحہ و بارود کا وافر ذخیرہ عنایت فرمایا جائے، تاکہ ہم اپنے دشمنوں سے خُود نبٹ سکیں اور قانون کو زحمت نہ کرنی پڑے۔

ہم وعدہ کرتے ہیں کہ کلاشنکوفوں، بندوقوں اور گولہ بارود کا استعمال صرف انہی پبلک مقامات پر کریں گے جو فلموں میں دکھائے جا رہے ہیں اُمید ہے آپ ہماری درخواست پر مناسب احکامات صادر فرمائیں گے۔

العارض

پُرامن اور شریف شہری

اِس درخواست کا خیال ہمیں فلم دیکھ کر آیا ہے اور ہمارا مؤقف یہ ہے کہ جب ہمارا ہیرو لکشمی چوک سے لوہاری گیٹ تک اور بھاٹی گیٹ سے چوبرجی تک ہزاروں افراد کی موجودگی اور رواں دواں ٹریفک کے ہجوم میں کشتوں کے پشتے لگا سکتا ہے۔ تو ہم نے کیا

قصور کیا ہے کہ ہمیں اس آزادی سے محروم رکھا جائے؟ ہم صرف انہی مراعات کے طالب ہیں جو ہم نے فلم میں دیکھی ہیں۔ مثلاً چند کلاشنکوفیں، چند جیپیں، اسلحہ بارود کا ڈھیر اور ڈز اڈز تے کھچا کھچ۔ اس سے زیادہ کے ہم طالب نہیں اور اسراف بیجا کے ہم قائل نہیں۔

ہمارا وعدہ ہے کہ اگر ہمیں مطلوبہ سامان مہیا کر دیا گیا تو ہم اس کا استعمال چھپ کر نہیں کریں گے۔ دن دیہاڑے پبلک مقامات پر سارا اسلحہ و بارود خرچ کریں گے اور اسی طرح بڑکیں مار کر کلہاڑیاں اور کلاشنکوفیں چلائیں گے، جس طرح اس فلم کے ہیرو نے چلائی ہیں۔

ہم نے جب اس خواہش کا اظہار اپنے دانشور دوست تمیز الدین اخلاق سے کیا تو وہ مربیانہ انداز میں مسکرائے۔ بولے "آپ کی خواہش کچھ اتنی غلط بھی نہیں۔ مار دھاڑ والی ہر فلم دیکھ کر تماشائی کا یہی جی چاہتا ہے۔ لیکن ایک بات وہ فراموش کر دیتا ہے۔"

ہم نے پوچھا "کون سی بات۔"

بولے "معاوضے کی بات۔ فلم میں ہیرو اس کام کے لاکھوں روپے لیتا ہے۔"

ہم نے کہا "ہمیں نہیں چاہئیں لاکھوں روپے۔ ہم مفت یہ کام کرنے کو تیار ہیں۔"

ہنسنے لگے "فلموں میں تو یہ سب کچھ اسکرپٹ کے تحت ہوتا ہے۔ کہانی کی ڈیمانڈ کے مطابق ہوتا ہے۔ آپ کے پاس یہ سب کچھ کرنے کا کیا جواز ہے؟" ہم نے ترکی بہ ترکی جواب دیا "فلم کے رائٹر اور پروڈیوسر کے پاس یہ سب کچھ کروانے کا کیا جواز ہے انہیں کھلی چھٹی کس نے دی؟"

بولے "عوام نے۔"

ہم نے پوچھا "عوام کا اس میں کیا قصور ہے۔ کیا وہ جلوس نکال کے فلمی اسٹوڈیوز کا گھیراؤ کرتے ہیں کہ للہ مار دھاڑ سے بھرپور فلمیں بناؤ ورنہ ہم ہڑتال کر دیں گے۔ یہیں اسٹوڈیوز کے سامنے دھرنا دے کے بیٹھ جائیں گے۔ ہڑتالی کیمپ لگا لیں گے۔"

تمیز الدین اخلاق صاحب نے بڑی خوش اخلاقی سے کہا "ٹھیک ہے وہ ایسا مطالبہ نہیں کرتے۔ چلو مان لیا۔ لیکن ہم نے یہ بھی تو نہیں دیکھا کہ عوام کا ہجوم اس قسم کی فلموں کے خلاف جلوس کی شکل میں اسٹوڈیوز پہنچا ہو۔"

ہم نے کہا "عوام شریف ہیں۔ وہ تو اپنے بنیادی حقوق کے لیے سڑک پر آنا پسند نہیں کرتے۔ کہتے ہیں کہ شرفاء کو یہ زیب نہیں دیتا پھر پرتشدد فلموں کے خلاف وہ سڑکوں پہ کیوں آنے لگے؟"

تمیز صاحب نے کہا "یہی وجہ ہے کہ فلم انڈسٹری قائم ہے۔ ایک گنڈاسے میں سے ڈیڑھ درجن گنڈاسے برآمد ہو رہے ہیں۔ ایک مولاجٹ کے نتیجے میں ایک سو مولاجٹ پیدا ہو رہے ہیں۔ آپ اکیلے کیا کر سکتے ہیں۔ جب آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہو۔"

ہم نے کہا "مگر محترم دانشور صاحب۔ اس صورتِ حال کا کوئی حل بھی تو ہونا چاہیئے۔"

تمیز الدین اخلاق صاحب نے لفافوں کے بنڈل میں سے ایک لفافہ نکال کر ہماری طرف بڑھایا۔ بولے "ایک اخبار کی طرف سے تشدد کے رجحان کے خلاف ایک محفل مذاکرہ منعقد ہو رہی ہے۔ آپ ضرور آئیے گا۔ شرکا کے نام دیکھ لیں۔"

ہم نے لفافہ کھول کر دعوت نامہ دیکھا اور ایک گہرا سانس لے کر لفافہ میز پر رکھ دیا۔ مذاکرے کے شرکا میں تمام نام وہی تھے جو تشدد، جرائم اور ڈز اڈز کے رجحان کو فروغ دینے والی فلمیں بناتے ہیں، یا ان میں کام کرتے ہیں۔

پیجا کلفی والا

گرمیوں کی چلچلاتی ہوئی دھوپ اور جھلستی ہوئی لو میں ڈوبی ہوئی گلیوں میں ایک آواز اُبھرتی تھی۔ کپّی کپّی کپّی۔" جب دُور سے یہ آواز ہماری گلی میں آتی تو اونگھتے ہوئے چونک کر اُٹھ بیٹھتے اور دیکھتے ہی دیکھتے پیجا کلفی والے کے گرد بچوں کا ہجوم جمع ہو جاتا۔

پیجے کی آواز لکنت زدہ تھی۔ ایک ہاتھ اور ایک پاؤں پر فالج کا ہلکا سا اثر تھا چلتے ہوئے تھوڑا سا لنگڑاتا تھا۔ قلفی والے ڈبے کا ڈھکن دونوں ہاتھوں کی مدد سے کھولتا تھا۔ بہت کم بولتا تھا اور جو کچھ بولتا تھا اسے صرف بچے سمجھ سکتے تھے۔ بڑوں کی سمجھ میں اس کی باتیں نہیں آتی تھیں۔ اسی لئے لوگ اسے جھانواں کہتے تھے۔ بازاروں میں ہٹے کٹے مشٹنڈے فقیروں کو بھیک مانگتے دیکھ کر ہمیں فوراً پیجا کلفی والا یاد آجاتا تھا۔ جو جسم اور زبان سے معذور ہونے کے باوجود کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا تھا، محنت کرتا تھا اور گلی گلی گھوم کر قلفیاں بیچتا تھا۔ بچوں کے دل ٹھنڈے کرتا تھا۔ اسے دیکھ کر اکثر جی چاہا کہ پیجے کو کسی دن روک بیٹھک میں بٹھائیں، یخ ٹھنڈے شربت کا گلاس پلائیں اور انٹرویو کریں، مگر پیجا خالصتاً محنت کش آدمی تھا۔ اسے محنت کرنے اور حق حلال کی کمائی سے غرض تھی۔ انٹرویو کا مطلب وہ نہیں سمجھ سکتا تھا۔ ویسے بھی جس طرح لفظ ٹوٹ پھوٹ کر اس کی زبان سے نکلتے تھے وہ ہماری سمجھ میں نہیں آسکتے تھے۔ وہ بلا ناغہ ڈھائی تین بجے ہماری گلی میں آتا تھا اور باقاعدگی کا یہ عالم ہوتا تھا کہ جس روز ہماری گھڑی میں کوئی خرابی ہوتی ہم اس کی کپّی کپّی سُن کر اپنی گھڑی ٹھیک کر لیتے تھے۔

ایک دن خلافِ معمول پیجا نہیں آیا۔ اس روز ہماری گھڑی ٹھیک نہیں تھی۔ لہٰذا شام تک خراب ہی رہی۔ شام کو پتہ چلا کہ گلی کے نکڑ پر جو ایک پولیس والا رہتا ہے۔ اس نے نیند خراب کرنے کی پاداش میں اس کی خوب ٹھکائی کی ہے اور آئندہ کے لیے گلی میں اس کا داخلہ بند کر دیا ہے۔ ہم نے محافظِ قانون سے پوچھو، کہ ایک معذور اور غریب آدمی کی پٹائی کرتے اور اس کی روزی پر لات مارنے کا انہیں کیا حق حاصل تھا؟

کہنے لگے۔ "بڑا ہی ذلیل آدمی ہے جی۔ ہم دن بھر کے تھکے ہارے روٹی شوٹی کھا کر ادھر ذرا قیلولے کی نیت سے لیٹتے ہیں، ابھی آنکھ لگنے ہی لگتی ہے کہ اس کی کپّی کپّی نیند کا بیڑا غرق کر دیتی ہے۔ ایک دن دو دن کی بات ہو تو آدمی صبر کرے۔ یہ تو روز کا ڈرامہ ہے۔"

ہم نے کہا۔ "بہرحال آپ نے زیادتی کی۔ مظلوم سا آدمی تھا۔ پیار سے سمجھا دیتے۔ مار پیٹ اور داخلہ بندی کی کیا ضرورت تھی؟"

بولے۔ "پیار سے بہت سمجھایا جناب۔ اس کے پلّے کوئی بات ہی نہیں پڑتی۔ اس نے جو بکواس کی اس کا مفہوم یہ نکلتا تھا کہ ڈھائی تین بجے سے پہلے وہ اس گلی میں نہیں آتا تھا۔ ——— اور اس نے اپنے روٹ مقرر کر

رکھے ہیں۔ ہر روٹ پر اپنے مقررہ ٹائم پر پہنچتا ہے۔ اس گلی کی باری ڈھائی تین بجے آتی ہے۔ اس سے پہلے نہیں۔ بس جناب اس بات پر غصّہ کھا کر میں نے اس کی پھینٹی لگائی۔ انشاء اللہ اب وہ ادھر کا رُخ نہیں کرے گا اور آپ بھی میری طرح سکون سے سو سکیں گے۔"

محافظِ قانون سے ہمارے مزید مکالمات بھی ہُوئے، جن کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگلے دن سے ہماری ان سے علیک سلیک اور بول چال بند ہو گئی۔ پیجے کلفی والے کا داخلہ تو بند ہُوا۔ لیکن گداگروں اور دیگر پھیری والوں کا داخلہ بند نہیں ہو سکا۔ جس کا جی جب چاہتا میگا فون آن کر کے یا حلق کا پُورا زور لگا کے یا ٹین کنستر کھڑکا کے اپنی چیزیں بیچتا تھا۔ ایک طرح سے ہماری گلی پھیری والوں کا ہائیڈ پارک تھی۔ یہاں ہر شخص کو گلی سڑی سبزیاں، ٹینڈے، ٹماٹر، خربوزے، آم، لوکاٹ، پتیسے، دال سویاں اور ٹافیاں بیچنے اور حلق کا پُورا زور لگا کے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کھُلی چھٹی تھی۔ ہمارے پڑوسی پولیس والے نے نہ اس پر کوئی اعتراض کیا نہ کسی کی پھینٹی لگائی نہ کسی کا گلی میں داخلہ ممنوع قرار دیا۔ اس پر ہمیں اکثر حیرت ہوتی تھی کہ قانون کے محافظ کا سارا تزلہ ایک غریب معذور اور شریف آدمی پر کیوں گرا؟ دوسروں پر انہوں نے نظرِ عنایت کیوں نہ ڈالی۔ جبکہ پیجے کے پاس نہ کوئی دستی لاؤڈ اسپیکر تھا۔ اس کی آواز اُونچی تھی۔ چونکہ محافظ صاحب سے ہماری بول چال بند ہو چکی تھی۔ لہٰذا ان سے تو کوئی استفسار کر نہیں سکتے تھے۔ البتہ ساتھ والی گلی میں ایک دن پیجا کلفی والا کپّی کپّی کرتا نظر آ گیا۔ بیچارے کے چہرے پر چوٹوں کے نشانات تھے آواز بھی سہمی سہمی تھی اور چال میں بھی لنگڑاہٹ پہلے سے زیادہ تھی۔ ہم نے اسے روک کر علیک سلیک کی۔ مصافحہ کیا۔ حال چال پوچھا اور آخر میں سوال کیا کہ دوپہر کو تقریباً سبھی پھیری والے آتے ہیں۔ اس پر بین کیوں لگ گیا ہے۔ پیجے نے لکنت زدہ زبان سے جو کچھ کہا اس کا اردو ترجمہ حاضرِ خدمت ہے۔

"بات یہ ہے باؤ جی کہ میں نے جب سے آنکھ کھولی ہے حق حلال کی کمائی کی عادت ڈالی ہے۔ نہ کسی بچّے کی جیب پر ڈاکہ ڈالتا ہُوں، نہ کسی بڑے کو اجازت دیتا ہُوں کہ وہ میری محنت کی روزی میں سے اپنا حصّہ مانگے اور مجھ سے بھتّہ وصول کرے۔ شہر میں گلیاں بے شمار ہوتی ہیں۔ ایک نہ سہی دوسری سہی۔ بڑے آدمیوں کے کچھ اصول ہوتے ہیں تو چھوٹے آدمی کے بھی تو کچھ اصول ہونے چاہئیں کیوں جی باؤ صاب؟"

آج کے مُنّے میاں

مُنّے میاں کے سوالوں سے ہم بہت تنگ ہیں۔ خیر سے وہ ابھی چار پانچ برس کے ہیں لیکن انہیں یہ فکر پڑ گئی ہے کہ انکل یہ ہارس ٹریڈنگ کیا ہوتی ہے ؟

ہم نے اُلٹا انہی سے پوچھ لیا۔ ہارس معنی ؟"

جھٹ بولے۔ "گھوڑا۔"

ہم نے کہا "شاباش۔ اور ٹریڈنگ کیا ہوتی ہے۔"

اس پر مُنّے میاں سٹپٹا گئے۔ انگریزی کا جو قاعدہ وہ پڑھ رہے ہیں، سردست اس میں ہارس آیا ہے۔ ٹریڈنگ ابھی نہیں آئی۔ لہٰذا ان کا پریشان ہونا بالکل فطری تھا لیکن وہ ذہین سیاست دانوں کی طرح کسی سوال کے جواب میں یہ نہیں کہتے "مجھے معلوم نہیں"۔ بس ایک سوالیہ سی چُپ سادھ کر ہماری طرف دیکھتے ہیں یا دیواروں کی طرف۔

ہم نے انہیں ٹریڈ اور ٹریڈنگ کے علاوہ احتیاطاً ٹریڈ مارک کا مطلب بھی سمجھا دیا تاکہ بچّے کی معلومات میں اضافہ ہو اور زندگی میں آگے جا کر جب کبھی ان چیزوں سے اس کا واسطہ پڑے تو اسے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔

ہمیں بچپن سے اب تک کسی نے یہ نہیں بتایا تھا کہ ہارس ٹریڈنگ کیا ہوتی ہے۔ یہ تو اخبارات کی مہربانی سے ہمارے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہُوا۔ اسی لیے ہم روز اخبار پڑھتے

ہیں۔ کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ تھوڑی دیر بعد مُنّے میاں آجائیں گے اور آتے ہی ہم سے پوچھیں گے۔ "انکل یہ فلور کراسنگ کیا چیز ہے۔"

مُنّے میاں ہمارے پڑوسی ہیں اور اس نوخیز نسل کی کونپل ہیں جسے آگے چل کر پھول بننا ہے۔ پتہ نہیں گوبھی کا پھول یا گلاب کا پھول۔ البتہ آثار بتاتے ہیں کہ مستقبل قریب میں ان کے عینک لگ جائے گی، اور بال بڑھائے، سگریٹ پھونکتے ہوئے وہ چٹکی بجا کر گُل جھاڑتے ہوئے کہا کریں گے "بائی دی وے انکل" ہمارے ہاں سنسر اتنا نیرو مائنڈڈ کیوں ہے۔ ہم سنسر کی قید سے آزاد فلمیں کیوں نہیں بناتے۔ ماشاءاللہ ہمارے ہاں کسی چیز کی کمی نہیں۔ بدر منیر ہے۔ مسرت شاہین ہے۔ امان اللہ ہے۔ شبانہ شیخ ہے۔ منزہ شیخ ہے۔ منیتا خان ہے۔ اتنا سہم سہم کر، بچ بچ کر، مُرغی چوروں کی طرح دائیں بائیں دیکھ کر فلمیں بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ آجاؤ کلیئر کٹ میدان میں۔!

ایک دن مُنّے میاں نے ہم سے پوچھا "انکل! یہ بچے کہاں سے آتے ہیں ؟ ہم فوراً محتاط ہو گئے۔ ان کا سوال انہی کو لوٹا دیا۔ "تم بتاؤ۔ تمہاری اطلاعات کیا ہیں ؟

کہنے لگے "ابّو نے بتایا تھا کہ فرشتے گھر میں ننھے بچوں کو چھوڑ جاتے ہیں۔ امّی کہتی ہیں، غلط ہے۔ بچے تو ڈاکٹر کے کلینک یا ہسپتال میں ہوتے ہیں۔ اب آپ بتائیں۔"

ہم نے کہا "دیکھو مُنّے۔ یہ وقت تمہارے پڑھنے کا ہے۔ انگلش ریڈر کھولو اور کل والا سبق ہمیں سناؤ۔"

مُنّے میاں فوراً آمادہ ہو گئے۔ مگر ایک شرط عائد کر دی۔ بولے "پہلے آپ بچوں والا مسئلہ حل کریں۔"

ہم نے کہا: "دیکھو بچے اللہ دیتا ہے۔ اور اللہ کے کاموں میں بندہ کوئی مداخلت نہیں کر سکتا۔ سمجھے۔ بس اب جاؤ اور انگلش ریڈر لے کر آؤ۔ ورنہ اللہ ناراض ہو جائے گا جاؤ شاباش۔"

مُنّے میاں چلے تو گئے۔ مگر بادلِ نخواستہ۔ ہم کوئی موزوں جواب سوچتے رہے، مگر وہ سارا دن لوٹ کر نہیں آئے۔ اگلے دن آئے تو خاصے رُوٹھے ہُوئے تھے۔ ہم نے سبب پُوچھا تو تنک کر بولے: "جائیے ہم آپ سے نہیں بولتے۔ آپ ہمیں ٹرخاتے ہیں۔ دایہ مائی پھاتاں نے ہمیں سب کچھ بتا دیا ہے۔" ہمیں مائی پھاتاں پر بڑا غصّہ آیا۔ جی چاہا اسے بُلا کر خوب ڈانٹیں کہ معصوم بچّے کا ذہن خراب کر رہی ہے۔ ابھی سے انہیں فلسفۂ پیدائش کے رموز بتا رہی ہے۔ اتفاقاً مائی پھاتاں ہمیں راستے میں مل گئی۔ ہم نے پہلے سے تو اسے خوب ڈانٹ پلائی۔ پھر دھمکی دی کہ اگر کسی بچّے سے اس نے ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کیں تو محلّے کے معتبرین کی میٹنگ بُلا کر آئندہ کے لیے اس محلّے کی خواتین کی زچگی وغیرہ کے سلسلے میں اس کی خدمات کا مکمل بائیکاٹ کر دیا جائے گا۔

اس پر وُہ گھبرا گئی۔ دوپٹے سے پسینہ پُونچھتے ہُوئے بولی: "وے پُتّر! مَیں غریب جاہل عورت ہُوں۔ میری روزی پر لات نہ مارنا۔ تمہیں اللہ کا واسطہ۔ اصل میں یہ بچّہ نہیں مُصیبت ہے۔ کل سے بار بار مجھے دس روپے کا لالچ دے کر پُوچھ رہا ہے کہ بچّے کیسے اس دُنیا میں آتے ہیں۔ پہلے تو مَیں ٹالتی رہی۔ پھر مجبوراً دس روپے لے کر تھوڑی بہت معلومات دے دیں۔"

مائی پھاتاں کو ڈانٹ ڈپٹ کر اور آئندہ کے لیے محتاط رہنے کی تنبیہہ کر کے ہم

پلٹے تو مُنّے میاں کو اپنی بالکنی سے جھانکتے پایا۔ ابھی کمرے میں پہنچ کر ہم نے بیٹھنے اور بیٹھنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ مُنّے میاں آدھمکے۔ خاصے مشکوک تھے۔ بولے: "کیا باتیں کر رہے تھے آپ مائی پھاتاں سے؟"

ہم نے کہا: "خیر و عافیت پُوچھ رہے تھے۔"

وُہ ہمارے قریب آ کر دھیمی آواز میں بڑی رازداری سے بولے: "عورتوں سے باتیں نہ کیا کریں انکل، ورنہ لوگ غلط مطلب نکالیں گے۔"

ہم نے حیرت سے کہا: "کیا مطلب؟"

بولے: "امّی کہہ رہی تھیں کہ تمہارے انکل شریف آدمی ہیں، مگر یہ عورت بڑی مردمار ہے۔ چار شوہروں سے طلاق لے چکی ہے۔ یہ مردمار کیا ہوتا ہے انکل۔ سچ سچ بتا دیں، ورنہ مَیں خود مائی پھاتاں سے پُوچھ لوں گا۔"

مُنّے میاں نمبر ۲

خیر سے ایک اور مُنّے میاں ہیں۔ یہ صرف سوالات ہی نہیں کرتے فرمائشیں بھی کرتے ہیں۔ مناسب سمجھتے ہیں، تو حکم بھی صادر فرما دیتے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں ہم نے ان کی چھٹی سالگرہ میں شرکت کی اور ان کے لیے گیند بلّے کا تحفہ لے گئے۔ یہ تحفہ انہوں نے نیم دلی سے قبول تو فرما لیا مگر ساتھ ہی پُوچھ بیٹھے،، انکل، میری وکٹیں اور دوسری چیزیں کب لائیں گے ؟"

ہم نے مزید فرمائشوں سے بچنے کے لیے جھٹ کہہ دیا۔" تمہاری اگلی سالگرہ پر"

یہ سُن خفا ہو گئے، منہ بسور کر بولے۔" اتنی دیر تک میں کیا کروں گا۔ سالگرہ تو بہت دیر بعد آتی ہے۔ پُورا ایک سال لگتا ہے۔ پچھلے سال آپ نے صرف بشرٹ دی تھی، پتلون ابھی تک نہیں دی۔"

اگلے دن انہوں نے ہم سے پُوچھا۔" انکل۔ لوگ شادی کیوں کرتے ہیں ؟"

ہم نے کہا۔" اکٹھے رہنے کے لیے۔"

بولے۔" اکٹھے رہنا کیوں ضروری ہے ؟"

ہم نے سمجھایا،" تاکہ امن سکون سے رہیں۔ وقت پر کھانا کھائیں۔ گھر کے کام کریں ٹی وی دیکھیں، مزے سے سیریں کریں۔ شاپنگ کریں۔"

کچھ دیر تک وہ کچھ سوچتے رہے۔ پھر بولے۔" یہ سارے کام تو آدمی اکیلا بھی کر سکتا ہے۔ پھر شادی کے لیے اتنے پیسے خرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

ہم نے کہا۔" ذرا اس سے معاشرے میں سکون پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک گھر بن جاتا ہے۔ اسی طرح ایک ایک کر کے بہت سے گھر بن جاتے ہیں اور بہت سے گھر جب مل جائیں تو شہر بن جاتے ہیں۔"

وہ ہمارے جواب سے کچھ مطمئن نہیں ہوئے۔ لیکن اپنا اضطراب ہم پر ظاہر نہیں کیا۔ تھوڑی دیر بعد بولے۔" اچھا فرض کریں، اگر میں شازیہ سے شادی کر لوں۔ پھر ایک گھر بن جائے گا ؟"

اس پر ہم بوکھلا گئے۔ پُوچھا۔" کیا مطلب ؟"

کہنے لگے۔" شازیہ میری کلاس فیلو ہے ناں۔ سالگرہ میں بھی آئی تھی، بڑی پیاری لگ رہی تھی۔ یاد آیا ؟"

ہم نے کہا۔" بالکل یاد آیا۔ مگر اس نیک کام کے لیے آپ کو دس پندرہ سال انتظار کرنا پڑے گا۔ تاکہ آپ دونوں کی تعلیم مکمل ہو جائے۔"

یہ سُن کر مُنّے میاں کا منہ لٹک گیا۔ انتہائی مایوسی سے بولے۔" اتنی دیر تک میں کیا کروں گا۔ شازیہ تو ایک دن سکول نہ آئے تو میرا دل نہیں لگتا۔"

مُنّے میاں کے سوال و جواب یہیں ختم نہیں ہوئے۔ کہنے لگے۔" شادی کے لیے کیا کرنا پڑتا ہے۔ انکل۔ ؟"

ہم نے کہا۔" لڑکی کے والد سے بات کرنی پڑتی ہے۔"

اس پر ان کی سٹی گُم ہو گئی، بولے۔" توبہ توبہ۔ شازیہ کے والد تو بڑے سخت ہیں میں نہیں کر سکتا ان سے یہ بات۔ میری طرف سے آپ جا کر بات کر لیں۔"

ہم نے کہا "اچھا کریں گے۔ اب آپ جا کر باہر کھیلیں اور اچھے بچوں کی طرح ہمیں کام کرنے دیں۔"

وہ طوعاً و کرہاً اُٹھے۔ جاتے جاتے بولے "کیا کام کریں گے آپ۔؟"

ہم نے کہا۔ "خط لکھیں گے؟"

فوراً بولے "کس کو۔ آپ کی بھی کوئی شازیہ ہے۔"

دو تین دن تک وہ وقفے وقفے سے ہمارے کمرے میں جھانک کر پوچھتے رہے "انکل۔ آپ نے شازیہ کے ابّو سے بات کی تھی؟"

ہم ٹالتے رہے کہ فرصت نہیں ملی۔ جیسے ہی فرصت ملے گی، سیدھے شازیہ کے ابّو کے پاس جا کر تمہارا پیغام دیں گے۔ لیکن مُنّے میاں زیادہ دن تک اپنی فرمائش پر قائم نہیں رہے ایک دن صبح ہی صبح ہمارے پاس آگئے۔ کہنے لگے۔ "انکل۔ آپ نے شازیہ کے ابّو سے بات تو نہیں کی۔"

ہم نے مسکین سی صورت بنا کر کہا "کریں گے یار۔ فکر نہ کرو۔ ذرا تھوڑی سی فرصت مل جائے۔"

بولے "نہیں انکل۔ اب رہنے دیں۔ شازیہ کے ابّو سے کوئی بات نہ کریں، میری اس سے کٹّی ہو گئی ہے۔"

ہم نے پوچھا۔ "کیوں؟"

بولے "مجھے اپنی کلاس ٹیچر پسند آگئی ہیں۔ اب میں ان سے شادی کروں گا بے شک آپ ان کے ابّو سے جا کر ابھی بات کر لیں۔ میں تیار ہوں۔"

چری پہاڑ سے اُڑی

لاہور ہمیں اس لیے پسند ہے کہ یہاں لوگوں میں بے ساختگی بہت ہے۔ تصنع بالکل نہیں۔ قواعد و گرامر کا معاملہ صرف سکولوں، کالجوں تک ہے عام آدمی منہ بگاڑ کے نہیں بولتا۔ زبان کو اینٹھتا مروڑتا نہیں۔ اسے قدرتی حالت میں رکھتا ہے۔ لہٰذا لفظ دل سے نکلتے ہیں۔ لہٰذا لفظ دل سے نکلتے ہیں اور زبان، تالو اور حلق کے جھٹکے کھائے بغیر سیدھے مخاطب کے دل میں اُترتے ہیں۔ سادگی اور صاف گوئی کا یہ عالم ہے کہ جہاں رے کی ضرورت ہو وہاں ڑے استعمال کرتے ہیں۔ زبان کا یہ لطف اور لہجے کی یہ چاشنی ہمیں کسی اور شہر میں نہیں ملتی۔ اسی لیے ہم لاہور اور اس کے لہجے سے پیار کرتے ہیں خاص طور پر اُرشد لہوڑی صاحب سے ہمیں بہت پیار ہے۔ وہ ہمیشہ اپنا نام صاف صاف ارشد لاہوری لکھتے ہیں۔ لیکن بولتے وقت اپنے لکھے کی زیادہ پرواہ نہیں کرتے ایک دن کہنے لگے۔ اُردو ہماڑی قومی زبان ہے، اوڑ ہماڑا فرض ہے کہ اُردو کے فڑوغ کے لیے کام کڑیں۔"

اکٹھی اتنی ساری "ڑے" کی یلغار دیکھ کر ہم پریشان ہو گئے ہم نے کہا "اُرشد لہوری صاحب۔ یے شک آپ کا جذبہ قابلِ تحسین ہے لیکن کیا ہی اچھا ہو کہ اس فروغ کے سلسلے میں آپ ڑے اور رے کو آگے پیچھے نہ کریں۔"

کہنے لگے۔ بہت بہتر جناب۔ آپ فکر نہ کریں۔ میری طرف سے اُردو کی خدمت میں کوئی کسر باقی نہیں رہے گی۔"

ایک مرتبہ انہیں معاشرے میں ادیب کے کردار کے بارے میں کہیں تقریر کرنی تھی بنیادی نکات پر گفت و شنید کے لیے ہمیں سعادت بخشی کہنے لگے: "معاشرے میں ادیب کا کردار کیا ہونا چاہیئے؟"

ہم نے کہا۔ "اچھا ہی ہونا چاہیئے۔ خراب ہوگا تو پڑھنے والوں کو بھی خراب کرے گا"

بولے "آپ میری بات نہیں سمجھے۔ مجھے ایک تقریر اس موضوع پر کرنی ہے"۔ ہم نے کہا بحمد اللہ۔ وہ تو آپ کر لیں گے لیکن ٹرے کا کیا بنے گا؟"

کہنے لگے۔ "جب میں اسٹیج پر ہوتا ہوں تو کوشش کرتا ہوں کہ غلطی نہ کروں۔ اگر غلطی ہو جائے تو لوگ مائنڈ نہیں کرتے۔ کیونکہ ان کا بھی یہی مسئلہ ہے جو میرا ہے۔"

ہم نے کہا: "اچھا ایک دن ہم اطمینان سے بیٹھ کر پریکٹس کریں گے کہ ٹرے کو ٹرے کی جگہ بولا جائے اور رے کو رے کی جگہ — منظور"

بولے "منظوڑ — ہزاڑ واڑی منظوڑ۔"

وہ دن جلد آگیا۔ ہم دونوں مری کی سیر کے لیے گئے۔ ارشد لاہوری پہاڑ اور پہاڑیاں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ہم نے اس خوشی کے موقع پر سامنے والے پہاڑ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا: "وہ کیا ہے؟"

کہنے لگے "پہار"

ہم نے کہا "پہار نہیں پہاڑ"

بولے "پہاڑ — پہار — پہار —"

ہم پہاڑ پر چڑھتے رہے۔ ساتھ ساتھ کہتے رہے: "ٹھیک ہے شاباش بولتے رہیں پریکٹس جاری رکھیں۔"

نصف پہاڑ طے کیا تھا کہ ان کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ سانسیں دھونکنی کی طرح چلنے لگیں۔ چہرہ سُرخ ہو گیا۔ آنکھیں حلقوں سے اُبلنے لگیں۔ یہی حال ہمارا ہوا تاہم ہانپتے ہوئے ہم نے ایک چڑیا کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

ہانپ ہانپ کر بولے۔ "چری۔"

ہم نے جواباً ہانپتے ہوئے کہا۔ "چری نہیں چڑی۔ چڑیا۔"

بولے: "چری — نہیں چری — چریا —"

اتنے میں چڑیا پھُر سے اُڑی اور یشب میں تیرتی چلی گئی بے ساختہ ارشد لاہوری نے کہا "چری پھُر سے اُری۔"

ہم نے کہا۔ "اُری نہیں اُڑی۔"

ہنس کر بولے: "آپ ہزاڑ لکھ واڑی پریکٹس کروالیں۔ چری پھُر واپس نہیں آئے گی۔ ایک بار اُر گئی تو ار گئی۔ فکر نہ کریں۔"

کوہ مری کی سیر کے دوران ہم ان کو چری کو چڑی اور چڑی کو چڑیا بنانے کی خدمت سرانجام دیتے رہے لیکن ارشد صاحب کی بے ساختگی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ لاہور واپسی تک وہ اپنا طرزِ تکلم دہراتے رہے اور اپنے لہجے سے عہدِ وفا نبھاتے رہے۔ لاہور پہنچ کر ہم نے اپنی شکست کا اعلان کر دیا۔

اس پر وہ دھیرے سے مسکرائے۔ کہنے لگے "بادشاہو، زبان بگڑنے سے زبان درست نہیں ہوتی۔ اگر واقعی زبان کا فروغ چاہتے ہیں تو پھر ہر علاقے کی زبان کے لہجے کو اپنانا پڑے گا۔ ساری زبانیں اور سارے لہجے مل جل کر جو زبان بنائیں گے، وہی زبان اصلی اور سچی زبان ہوگی۔ چاہے آپ اس کا نام پاکستانی زبان رکھیں یا اردو زبان۔ کیوں میرے مہربان — ؟"

ہم نے کہا۔ "اس میں کیا شک ہے۔ وہی زبان قومی کہلانے کی مستحق ہوگی، جو پوری قوم کی آرزوؤں، امنگوں، خوابوں، خواہشوں، لہجوں اور علاقوں کی ترجمان ہوگی۔ اب وہ دور نہیں رہا جب ہم شین قاف کی زلفیں سنوارنے کے لیے عمریں گنوا دیں۔ ویسے بھی آدمی کی اوسط عمر زیادہ نہیں رہی۔"

وہ مسکرائے۔ دیوار پر لگی ہوئی پہاڑ کی ایک پینٹنگ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ "وہ کیا ہے ؟"

ہم نے بے ساختہ کہا۔ "پہار — پہار —"

بولے "غور سے دیکھیں۔ کچھ اور نظر آ رہا ہے۔"

ہم نے غور کیے بغیر آنکھیں موند کر مکمل اعتماد سے کہا۔ "ہاں۔ چری۔ چریا۔"

انہوں نے اپنائیت سے ہمیں گلے لگا لیا۔ بولے "پھر بھی آپ دوبارہ غور کر لیں"

ہم نے ان کو بھینچتے ہوئے کہا۔ "غور کیا کرنا ہے یار، صاف نظر آ رہا ہے کہ چری پہار سے اُری —"

آپ کا کام ہو جائے گا

ظہور الدین عہدہ ہمارے دوست ہیں۔ ان کی وجہ شہرت ان کا تخلص نہیں ان کا شغل ہے۔ ان کا مشغلہ ہے لوگوں سے وعدے کرنا اور کر کے بھول جانا۔ سچ پوچھیے تو انہیں سیاستدان ہونا چاہیے تھا۔ لیکن شروع ہی سے وہ ادب کے طالب علم رہے ہیں، لہٰذا سیاست دان بننے سے بال بال بچے۔ ان کا ذریعۂ معاش اسٹیشنری کی وہ دکان ہے جہاں اگر آپ معمولی بال پوائنٹ بھی جائیں گے تو وہ آپ کو نہیں ملے گا البتہ ظہور الدین عہدہ صاحب وعدہ ضرور کر لیں گے۔ "فکر کی کوئی بات نہیں۔ کل آ کر پتہ کر لیں، آپ کا کام ہو جائے گا۔" آپ اگلے دن جائیں گے تو پھر یہی وعدہ آپ کا منتظر ملے گا۔ ظاہر ہے ایک معمولی بات پوائنٹ کے لیے آپ تیسری دفعہ تو جانے سے رہے۔ لہٰذا قدرتاً آپ کا کام ہو جاتا ہے۔ یعنی آپ اپنا مطلوبہ قلم یا کوئی اور چیز کسی دوسری سے خرید لیتے ہیں۔

بات صرف اسٹیشنری کے سامان کی ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ بسا اوقات بڑے سے بڑے اسٹیشنر کے پاس آپ کی مطلوبہ چیز نہیں ہوتی۔ عہدہ صاحب تو پھر بھی بہت چھوٹی سی دکان کے مالک ہیں۔ لہٰذا ان کے ہاں کسی چیز کا بروقت نہ ملنا کوئی ایسی تشویش ناک یا حیرانی کی بات نہیں۔ لیکن عہدہ صاحب کے وعدوں کا سلسلہ محض اپنی

دکان تک ہی محدود نہیں، ماشاءاللہ آپ زندگی کے ہر شعبے کے متعلق وعدہ کر لینے کے ماہر ہیں۔ مثلاً آپ کے بچے کو اسکول یا کالج میں داخلہ درکار ہے اور بہزار کوشش یہ مسئلہ حل نہیں ہو رہا۔ اتفاقاً اس مسئلے کی سن گن عہد صاحب کو مل جاتی ہے۔ وہ فوراً آپ کو تسلی دیتے ہیں "فکر نہ کریں۔ میں خود وزیر تعلیم صاحب سے بات کروں گا۔ آپ کا کام ہو جائے گا۔" آپ یہ خوشخبری سن کر نہال ہو جاتے ہیں۔ عہد صاحب کو ڈھیروں دعائیں دیتے ہیں اور احباب و اقربا میں عہد صاحب کے وسیع تعلقات اور انسان دوستی کا پرچار کرتے ہیں۔ جب کئی دن بیت جاتے ہیں اور عہد صاحب کے ذریعے وزیر تعلیم کی جانب سے کوئی حوصلہ افزا پیغام یا خبر موصول نہیں ہوتی تو آپ لامحالہ پریشان ہو جاتے ہیں اور عہد صاحب کے پاس پہنچتے ہی علیک سلیک کے بعد دریافت کرتے ہیں "کیوں عہد صاحب۔ میرے کام کا کیا بنا؟"

عہد صاحب ماتھے پر درجن بھر شکنیں ڈال کر انتہائی حیرت سے پوچھتے ہیں۔

"کون سا کام؟"

"وہی وزیر تعلیم والا۔؟" آپ مسکرا کر انہیں یاد دلاتے ہیں۔

"وزیر تعلیم؟" وہ مزید شکنیں ڈال کر پوچھتے ہیں۔ کون سے وزیر تعلیم۔ وفاقی کہ صوبائی؟"

اب آپ ان کی پریشانی دور کرنے اور ان کی کھوئی ہوئی یادداشت بحال کرنے کے لیے از سر نو اپنے بچے کا مسئلہ بیان کرتے ہیں۔ اس پر عہد صاحب دونوں ہاتھ اٹھا کر کہتے ہیں۔ اچھا اچھا۔ سمجھ گیا۔ سمجھ گیا۔ فکر نہ کریں۔ میں موقع ملتے ہی

وزیر تعلیم صاحب سے بات کروں گا۔ آپ کا کام ہو جائے گا۔"

کسی کو ٹرین، ہوائی جہاز یا بحری جہاز میں سیٹ بک کروانی ہو۔ ٹریکٹر خریدنے کے لیے قرضہ لینا ہو۔ بیٹے یا بیٹی کے لیے مناسب بر کی تلاش ہو۔ کسی ملازمت کا حصول مطلوب ہو۔ کسی مقدمے کا فیصلہ اٹکا ہوا ہو۔ کسی مریض کو اسپتال میں فوری داخل کرانا مقصود ہو۔ گمشدہ کسی بچے کی بازیابی کا مسئلہ ہو۔ الغرض کوئی سا بھی مسئلہ ہو عہد صاحب سے بیان کر دیجئے۔ فوری طور پر تسلی مل جائے گی۔ اور آپ کا دل خوش ہو جائے گا۔

ایک دن ہم نے عہد صاحب سے گذارش کی "ایک عدد پلاٹ درکار ہے۔ آسان قسطوں پر دلوا دیجئے۔ مفت مل جائے تو اور بھی اچھا ہے۔"

پوچھنے لگے "یہ پلاٹ کون دے گا؟"

ہم نے کہا "حکومت دے گی اور کون دے سکتا ہے۔"

بولے "حکومت کے کس کارندے سے بات کرنی پڑے گی؟"

ہم نے عرض کی "کسی سے بھی بات کر لیں۔ حکومت کا تو ہر کارندہ کارآمد ہوتا ہے۔"

کچھ دیر تک سوچتے رہے اور منہ ہی منہ میں "ہوں، ہوں" کرتے رہے۔ پھر بولے "میں وزیر بلدیات سے بات کرتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔ آپ کا کام ہو جائے گا۔"

ہم نے احتیاطاً پوچھ لیا "آپ کس روز بات کریں گے۔"

بولے "بس دو تین دن میں۔ آپ چوتھے دن ٹھیک اسی وقت آ کر مجھ سے پتہ کر لیں۔"

ہم چوتھے دِن عہد صاحب کے پاس پہنچے۔ اُنہیں سلام کیا اور وعدہ یاد دلایا ماتھے پر ڈیڑھ درجن شکنیں ڈال کر بولے "کون سا وعدہ۔"

"پلاٹ والا۔" ہم مسکرائے۔

عہد صاحب چکرائے "پلاٹ؟ کس کہانی کا پلاٹ؟"

"اب ہم چکرائے۔ عرض کی "کہانی یا ڈرامے کا نہیں، حقیقی پلاٹ، زمینی پلاٹ"

بولے "پلاٹ کا کیا مسئلہ ہے۔ ذرا کھُل کے بیان کریں۔ زمرسل میں بات نہ کریں۔"

ہم نے پُوری تفصیل سے اپنے اور ان کے درمیان ہونے والی چار روزہ قبل بات چیت یاد دلائی۔ وُہ دونوں ہاتھ اُٹھا کر بولے "بس۔ بس۔ سمجھ گیا — سمجھ گیا — آپ فکر نہ کریں، آپ کا کام ہو جائے گا۔"

ہم نے پُوچھا۔ "کب تک ہو جائے گا؟"

بولے "یہی کوئی چار چھ دن تک — ؟"

"پھر کب آ کے معلوم کیا جائے؟ ہم نے تشویش بھرے لہجے میں پُوچھا۔

وُہ حسبِ معمول شاہانہ دریا دلی سے بولے "ساتویں دن آپ آ کر پتہ کر لیں۔"

ہم ساتویں دن پھر عہد صاحب کے پاس پہنچے۔ اب کے انہوں نے ابتدائی تفتیش سے ہمیں جلدی فارغ کر دیا۔ بولے۔"

پتہ کر لیں۔"

ایک غریب محلّے دار کی بیوی کھو گئی۔ گھر سے سودا سلف خریدنے گئی اور لوٹ کر نہیں آئی۔ میاں بیچارے نے ایک دن بچّوں کو سنبھالا تو اس کی چیں بول گئی۔ بڑا پریشان، خراب و خستہ حیران و پریشان بیٹھا ہُوا تھا، بیچ دالان کہ اتنے میں پہنچ گئے، ہمارے ظہور الدین عہد بھائی جان۔

پہلے تو درماندہ حال شوہر کو تسلّیاں دیں۔ پھر بچوں میں سے بعض کو چمکارا۔ بعض کو دھمکایا۔ آخر اُٹھتے اُٹھتے بولے۔ "فکر نہ کریں۔ میں ایس ایس پی صاحب سے بات کرتا ہُوں۔ آپ کل آ کر مجھ سے پتہ کریں۔ آپ کا کام ہو جائے گا۔"

دکھیارا شوہر اگلے دن ان کی دکان پر پہنچا۔ اس حالت میں کہ ایک بچّہ اس کی بغل میں تھا، ایک کاندھے پر، ایک ٹانگوں سے چپکا ہُوا اور ایک دامن سے لپٹا ہُوا اس نے پہلے تو جا کر انہیں سلام کیا۔ "سلاماں لیکم"

دردناک شوہر نے کربناک آواز میں کہا۔ "ان بچوں کی والدہ کے سلسلے میں حاضر ہُوا ہُوں۔"

"بولے "کیا وُہ تم سے طلاق کی طالب ہے؟"

شوہر گھبرا کر بولا "جی۔ وہ بات یہ ہے کہ۔ ایس ایس پی صاحب۔"

عہد صاحب اپنی رو میں تھے "اچھا اچھا۔ تو تمہاری بیوی ایس ایس پی صاحب کے بنگلے پر کام کرنا چاہتی ہے۔"

شوہر بوکھلا کر ٹانگوں سے چمٹے ہُوئے بچّے کو ایک دھپ رسید کر کے بولا۔ "نہیں جی۔ آپ کو مغالطہ ہُوا ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ کل آپ میرے گھر آئے تھے۔ اور آج آپ نے مجھے بلایا تھا۔"

عہد صاحب دونوں ہاتھ اُٹھا کر بولے "بس بس ۔ سمجھ گیا ۔ سمجھ گیا ۔ آپ پرسوں آکر مجھ سے پتہ کرلیں ۔ آپ کا کام ہوجائے گا ۔"

پرسوں وُہ غریب الدّیار ان کے پاس پہنچا ۔ اب وُہ تنہا تھا ۔ جاتے ہی فرفر اس نے ان کا وعدہ یاد دلایا ۔ پھر وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ انہوں نے ہاتھ اُٹھا کر اسے روک دیا ۔ بولے "اچھا ، اچھا ۔ سمجھ گیا ۔ سمجھ گیا ۔ اب آپ یُوں کریں کہ پانچویں دن آکر مجھ سے پتہ کرلیں ۔ آپ کا کام ہوجائے گا ۔"

وُہ غریب بھونچکا رہ گیا ۔ بولا "کون سا جنابِ عالی ۔ میں تو یہ بتانے آیا تھا کہ میری بیوی کل آئی تھی اور اب بچے بھی اپنے ساتھ لے گئی ہے پرسوں وُہ میکے میں جا کر بیٹھ گئی تھی ۔"

عہد صاحب پھر دونوں ہاتھ اُٹھا کر بولے ۔

"بس بس ۔ سمجھ گیا ۔ سمجھ گیا ۔ آپ اب یُوں کریں کہ ٹھیک دس دن بعد آکر مجھ سے پتہ کرلیں ۔ مَیں آپ کی دُوسری شادی کے لیئے مناسب بر ڈھونڈ لوں گا ۔ فکر نہ کریں ۔ آپ کا کام ہوجائے گا ۔"



ہور کی حال اے ؟

ہمیں ایک بے حد ضروری کال کرنی تھی ۔ اس پُوری سڑک پر جتنے پبلک کال آفس تھے ۔ سب میں بھیڑ جمع تھی ۔ ایک صاحب ریسیور رکھتے تو دوسرا لپک کر اُٹھا لیتا ۔ ایک کی بات ابھی ختم ہوتی کہ دوسرا ڈائل گھمانے لگتا ۔ ہم کسی ایسے پبلک کال آفس کی تلاش میں تھے جہاں بھیڑ کم ہو تاکہ ہم فون کرکے اپنے کرم فرما کو مطلع کرسکیں کہ ہم نے چند مصروفیات کی بنا پر اپنا ٹکٹ کینسل کروا دیا ہے لہٰذا وُہ ہمارا انتظار نہ کریں اور فوراً ایئرپورٹ چلے جائیں کیونکہ لاہور کی فلائٹ روانہ ہونے ہی والی ہے ۔

آخر ایک فون بوتھ ہمیں نظر آگیا ۔ یہاں بھیڑ نہیں تھی ۔ صرف ایک صاحب ریسیور تھامے کھڑے تھے ۔ مگر خاموش تھے ، جب تین منٹ بیت گئے اور وُہ ایک لفظ نہیں بولے تو ہمیں تشویش ہُوئی ۔ ہم نے گھڑی دیکھی بے چینی سے پہلو بدلا ۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں انتظار کرنے کو کہا ۔

ہم نے پھر گھڑی دیکھی ۔ مزید ایک منٹ بیت گیا ۔ اب تک وہ صمّ بکمّ بنے کھڑے تھے ۔ اب ہم جھنجھلا گئے ۔ ہم نے کہا "بھئی یا تو آپ بات کریں یا ریسیور چھوڑ دیں ، ہمیں ایک بہت ہی ارجنٹ کال کرنی ہے ۔"

ان صاحب نے نتھنے پھُلا کر ہمیں دیکھا ۔ بولے ۔ "مَیں کیا کروں جی ! اُدھر والوں نے

ہولڈ کرا رکھا ہے۔

مزید ایک منٹ اور بیت گیا۔ ہم نے ان کی طرف دیکھا۔ انہوں نے ریسیور کو گھور کے دیکھا۔ ہم جھلائے ہوئے بوتھ سے باہر نکل آئے۔ سڑک کے پار پی سی او کا بورڈ نظر آ رہا تھا۔ ہم ٹریفک کے ہجوم میں سے رستہ بناتے، بچتے بچاتے وہاں پہنچے۔ وہاں ایک صاحب فون پر بات کر رہے تھے۔ دوسرے صاحب کان کھجا رہے تھے۔ غالباً اپنی باری آنے کے منتظر تھے۔

"ہور کی حال اے۔" فون والے صاحب ریسیور سے مخاطب تھے۔ "میں نے تو یار شیور لیٹ بیچ ہی دی ہے۔ پٹرول بڑا کھانے لگی تھی۔ تمہاری فیٹ کیسی چل رہی ہے؟"

میں نے گھڑی دیکھی۔ کان کھجانے والے صاحب نے بیزاری سے فون والے صاحب کی طرف دیکھا۔

فون والے صاحب کہہ رہے تھے۔ "یار، اس فضول موسم میں شلوار قمیص ہی ٹھیک رہتی ہے۔ میں نے تو ابھی کل ہی تین جوڑے بنوائے ہیں، کلر؟ ایک کا گلابی ہے۔ دوسرے کا آف وائٹ، تیسرے کا ڈارک بلو۔ اس کے ساتھ دو واسکٹیں لی ہیں۔ ایک تو خدا تمہارا بھلا کرے کرنڈی والی وہی۔ جو تمہیں دکھائی تھی دکان میں۔ اور دوسری وائٹ۔ کچھ اس کے اندر سنہری سنہری سے دھاگے ہیں۔"

ہمارا جی چاہا کہ ریسور ان کے ہاتھ سے چھین لیں، لیکن صرف گھڑی دیکھ کر رہ گئے۔ کان کھجانے والے صاحب دوسرے فون کی طرف لپکے، جو ابھی ابھی خالی ہوا تھا۔ انہوں نے پھرتی سے نمبر گھمائے اور لائن ملنے پر بڑی معقول بات چیت شروع کی۔ "اصل میں آپ کو یہ بتانا تھا کہ فیصلہ تو ہو گیا مگر مکان کا قبضہ ابھی ہم نہیں لے سکتے۔ اب آپ کا کیا مشورہ ہے؟"

ادھر سے ایک طول طویل مشورہ ارسال ہونا شروع ہوا۔ یہ صاحب بیچ بیچ میں ٹھیک ہے جی! ٹھیک ہے۔ بالکل ٹھیک۔ بالکل درست۔ آل رائٹ۔ او کے کرتے گئے۔ جس پھرتی اور تیزی سے وہ بول رہے تھے۔ وہ بڑی حوصلہ کن تھی۔ ہم ان کے پیچھے جا کھڑے ہوئے تاکہ فون فارغ ہوتے ہی اپنا مطلوبہ نمبر ڈائل کریں۔

مگر یہ محض ہماری خام خیالی اور خوش فہمی تھی۔ بے شک مشورہ لینے والے صاحب نے کم وقت میں کم الفاظ کی پالیسی اپنائی تھی، مگر فون کے دوسرے سرے پر جو صاحب موجود تھے، وہ غالباً اپنے بستر پر دراز تھے اور اپنے کام دھندوں سے فارغ ہو کر اطمینان سے بیٹھے تھے۔ لہٰذا مشورہ دینے میں بڑی فراخدلی اور فیاضی کا ثبوت دے رہے تھے۔

ادھر سے مایوس ہو کر ہم پھر پہلے والے صاحب کے پاس پہنچے۔ وہ بڑی خوش دلی سے ٹانگوں کی قینچی بنائے، کاؤنٹر سے ٹیک لگائے کھڑے تھے اور کہہ رہے تھے۔ "نہیں یار، یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں، تم ایک گھنٹے تک میرے پاس آ جاؤ، پھر اکٹھے ان کی طرف جا کر بات کر لیں گے، اور بات بھی کیا کرنی ہے، صرف یہی کہنا ہے کہ یہ پرانی اینٹیں ہیں انہیں تراش خراش کے ذرا ٹھیک کر دیں۔ پیسے بھی وہ میرا خیال ہے زیادہ نہیں لے گا۔ میری وہ والی پینٹ یاد ہے نا تم کو وہ نیلی والی، جس کے پیچھے استری کا نشان پڑ گیا تھا۔ لو جی وہ بدبخت پینٹ ہم نے کباڑ خانے میں ڈال دی تھی۔ لیکن جب ٹھیک کروائی تو یقین کرنا خدا کی قسمیں کھا کر کہتا ہوں۔ ایسی زبردست فٹ آئی ہے کہ ساری پینٹیں ماند پڑ گئی ہیں۔ تو پھر آ رہے گھنٹے بعد۔؟"

ہم نے ذرا تلخ لہجے میں 'ہوں' کی آواز نکالی اور پھر اس کی تلخی کم کرنے کے لیے

کھنکھار کے انہیں متوجّہ کیا اور گھڑی دیکھی۔ اب انہوں نے نظر اُٹھا کر ہماری طرف دیکھا۔ پھر بیزاری سے بولے "اچھا یار۔ پھر بات کریں گے۔ تم ایک گھنٹے تک ہماری طرف پہنچو۔" یہ کہہ کر انہوں نے قدرے توقّف کیا پھر بولے "ہور کی حال اے؟"

یہ کہہ کر طوعاً و کرہاً ریسیور کریڈل میں رکھنے لگے، لیکن ہم نے آگے بڑھ کر اُچک لیا۔ جلدی جلدی نمبر ڈائل کیا۔ گھنٹی بجتے ہی جب اُدھر سے ریسیور اُٹھایا گیا تو ہم نے علیک سلیک اور تمہید کے بغیر بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "بھابی انہیں بتا دیں کہ فوراً ایئرپورٹ چلے جائیں۔ میں ان کے ساتھ لاہور نہیں جا سکوں گا۔"

ادھر سے آواز آئی۔ "پیغام کا شکریہ۔ اب دو منٹ رہ گئے ہیں، اور اتنی جلدی ہیلی کوپٹر سے بھی میں ایئرپورٹ نہیں پہنچ سکتا۔ لہٰذا فوراً فون بند کریں تاکہ میں اپنی ٹکٹ کینسل کرواؤں۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔ "آئی ایم ویری سوری۔ ہور کی حال اے ——— ؟"